شمارہ ۱۴، ۲۰۲۵ء

نمود

طلبہ کا سالانہ ادبی رسالہ

نگران: زاہد حسن

نائب مدیران: مہک شبیر، مصطفیٰ غیاث خاں

مرکزِ زبان و ادب

LUMS | Gurmani Centre for Languages and Literature

فہرست مدیران نمود ۲۰۱۲ء تا ۲۰۲۴ء

شمارہ ۱، ۲۰۱۲ء	مدیر:	عمر نعیم سکھیرا
شمارہ ۲، ۲۰۱۳ء	مدیر:	سارہ فاطمہ
شمارہ ۳، ۲۰۱۴ء	مدیر:	فرقان اشرف
شمارہ ۴، ۲۰۱۵ء	مدیران:	محمد عاکف رمضان، سید عمار اختر کاظمی
شمارہ ۵، ۲۰۱۶ء	مدیران:	وکش اویس، اسد اللہ خان
شمارہ ۶، ۲۰۱۷ء	مدیر:	اسد اللہ خان
شمارہ ۷، ۲۰۱۸ء	مدیر:	محمد بلال اعظم
شمارہ ۸، ۲۰۱۹ء	مدیر:	محمد بلال اعظم
شمارہ ۹، ۲۰۲۰ء	مدیر:	راز احتشام
شمارہ ۱۰، ۲۰۲۱ء	مدیران:	مالی وسان، شیریں عباس
شمارہ ۱۱، ۲۰۲۲ء	مدیران:	مریم عامر، نتالیہ حیات
شمارہ ۱۲، ۲۰۲۳ء	مدیران:	فاطمۃ الزہرا، محمد زوہیب احمد
شمارہ ۱۳، ۲۰۲۴ء	مدیران:	محمد شجیع سہیل فاروقی، فروا مجاہد

فہرست

اداریہ	زاہد حسن	۵

اردو

مضامین

مراۃ العروس	عمیرہ عرفان	(طالبہ لمز)
لاجونتی	حاجرہ مبین	(طالبہ لمز)
منٹو: فحاشی یا فکری بغاوت	فاطمہ عمران	(طالبہ لمز)
فیض احمد فیض	مہک شبیر	(طالبہ لمز)
افسانہ ''محاصرہ'' کا فنی و فکری جائزہ	شاہ نواز خان شہیدیؔ	(طالب علم لمز)
افسانہ ''درائے گئے شہروں کے باطن'' کا فنی و فکری جائزہ	محمد مجیب رضا بخاری	(طالب علم لمز)
افسانہ ''جانِ من و جانِ شما'' پر مکالمہ	ایمن تنویر	(طالبہ لمز)
ایک افسانے پر مکالمہ	سیدہ کبریٰ عباس	(طالبہ لمز)
افسانہ ''درزی'' پر نوٹ	عائشہ شہوار	(طالبہ لمز)
افسانہ ''کھول دو'' پر نوٹ	عمیرہ عرفان	(طالبہ لمز)
پنجابی فلم ''انگریج'' پر ریویو	زینب رشید	(طالبہ لمز)
منٹو ''ٹھنڈا گوشت'' اور ''مقدمے'' کی داستان	فاطمہ عمران، حاجرہ جبین، حارث سرور، صہیب افضل	(طلبا لمز)

پنجابی

مضامین

بابا بلھے شاہؒ	علی مرتضیٰ بلوچ	(طالب علم لمز)
مواعظِ نوشہ دا تجزیہ	طلحہ حسنین	(طالب علم لمز)
جنگ نامے تے مرثیے	عبدالمعیز	(طالب علم لمز)

ڈائری نویسی

ڈائری	عمر امجد مغل	(طالب علم لمز)
ڈائری	زینب رشید	(طالبہ لمز)
ڈائری	مریم طاہر	(طالبہ لمز)
ڈائری	ایمان عتیق	(طالبہ لمز)
ڈائری	علینہ ذکریا	(طالبہ لمز)
ڈائری	اسما اشرف	(طالبہ لمز)
ڈائری	زینب حُر	(طالبہ لمز)
ڈائری	لائبہ طاہر	(طالبہ لمز)

کشمیری

عبدالاحد آزاد: شاعرِ انسانیت	ڈاکٹر زاہد عزیز	(استاد کشمیری زبان، لمز)	۱۲۸

اداریہ

گرمانی مرکز زبان و ادب، پاکستان قومی زبانوں کی تعلیم کا ادارہ ہے۔ نمود بنیادی طور پر انھی زبانوں کی تعلیم حاصل کرنے والے طلبا و طالبات کی تحریروں سے آراستہ ہونے والا شمارہ ہے۔ زیرِ مطالعہ شمارہ اس سلسلے کی چودھویں کڑی ہے۔ گویا نمود کو مسلسل شائع ہوتے ہوئے چودہ برس ہو گئے۔ یہ انسانی فطرت میں شامل ہے کہ وہ نئی نئی تہذیبوں کو جاننے میں لگا رہتا ہے خاص طور پر ایسا انسان جو اپنی تہذیب و ثقافت سے محبت رکھتا ہے وہ دیگر تہذیبوں کے لیے بھی خاص جذبہ رکھتا ہے۔ اور خاص طور پر اپنی ہمسایہ تہذیبوں اور زبانوں سے اس کی دل چسپی اس لیے بھی بڑھ کر ہوتی ہے کہ اُسے لگتا ہے اس ہمسایہ تہذیب کا سوتا بھی وہیں سے پھُوٹا ہے جس سوتے سے اس کی اپنی تہذیب نے نمو پائی ہے۔ پاکستان مختلف زبانوں اور تہذیبوں کا خوب صورت گُل دستہ ہے۔ یہاں کے باسی ہزارہا برس پر محیط تہذیبوں اور زبانوں کے وارث ہیں۔ ایسے میں اُن طلبا و طالبات کی تحقیقی جستجو کا دائرہ کار اور بھی وسیع ہو جاتا ہے۔

گرمانی مرکز زبان و ادب میں پڑھائی جانے والی زبانوں کے لیے تیار کیے گئے نصابات میں بھی ان باتوں کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ بچوں کو زبان سِکھانے کے ساتھ ساتھ اس زبان کی تواریخ، تہذیب، شعر و ادب اور بنیادی معاشرت سے بھی انہیں آگہی حاصل ہو۔ یہی وجہ ہے طلبا و طالبات نہ صرف ان زبانوں کو سیکھنے میں دل چسپی ظاہر کرتے ہیں۔ بلکہ اس زبان سے متعلق حاصل کیے گئے بنیادی علوم کے بارے میں اپنا اظہار بھی کرتے ہیں۔ ان کے اظہار کا یہ طریقہ بعض اوقات تخلیقی نوعیت کا ہوتا ہے اور کئی بار وہ اس کا دائرہ کار وسیع کرتے

ہوئے اس بارے میں اپنی تحقیق بھی پیش کرتے ہیں۔ نمود دراصل ان طلبا و طالبات کی اپنی تخلیقی اور تحقیقی اور بعض اوقات تنقیدی تحریروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ یوں علوم بشریات سے تعلق رکھنے والے ماہرین کی یہ بات بھی اس شمارے پر صادق آتی ہے کہ اپنی لسانی، تہذیبی اور ادبی وراثت کو آنے والی نسلوں تک پہچاننے کے لیے ان کے تخلیقی سوتوں اور تحقیقی و تنقیدی وژن کو بیدار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یوں طلبا و طالبات سے متعلق ایسے شمارے اور دیگر ادارے دراصل یہ کام بہ احسن سرانجام دے رہے ہوتے ہیں۔

گرمانی مرکز زبان و ادب لمز، میں زبانیں پڑھانے کے ساتھ ساتھ اس ادارے کو یہ تخصیص بھی حاصل ہے کہ یہاں طلبا کو ان زبانوں کی تہذیب و ثقافت اور کلچر کی رنگارنگی کے اظہار کا بھی بھرپور موقع دیا جاتا ہے جس سے یہاں کے طُلبا میں اپنی زمین اور زبانوں سے جُڑت اور زیادہ مستحکم ہوتی ہے۔

نمود ۲۰۲۵ء میں اردو تحریروں کے ساتھ ساتھ ایک بڑا حصہ پنجابی تخلیقات پر مشتمل ہے جب کہ ایک مختصر تحریر کشمیری کے نامور شاعر کے بارے میں ہے جو طلبا و طالبات کے علاوہ یہاں کے اساتذہ کے لیے بھی سود مند ثابت ہو گا۔

زاہد حسن

اردو

نمود، شمارہ ۱۴، ۲۰۲۵ء

عمیرہ عرفان

مراۃ العروس

مولوی نذیر احمد دہلوی ۱۸۳۰ء میں اُتر پردیش کے ضلع بجنور کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ جب نذیر احمد چار سال کے ہوئے تو ان کے والد بجنور منتقل ہو گئے جہاں نذیر احمد کو ایک روایتی مکتب میں داخل کر دیا گیا۔ فارسی اور عربی کا معقول علم حاصل ہونے کی بنیاد پر انہیں ۱۸۴۲ء میں دہلی بھیج دیا گیا جہاں وہ اورنگ آبادی مسجد میں رہے اور تعلیم حاصل کرتے رہے۔ یہاں مولوی عبد الخالق اور علامہ سیّد نظیر حسین جیسے معلم موجود تھے جو قرآن اور حدیث کا درس دیتے۔ دہلی میں اپنے قیام کے دوران نذیر احمد مولوی عبد الخالق کے گھر سے کھانا لینے جاتے اور وہاں مولوی صاحب کی بیٹی نذیر احمد سے کام لیتی۔ آگے جا کر یہی ان کی زوجہ بنیں۔

۱۸۴۶ء میں نذیر احمد کا وظیفہ پر دہلی کالج داخلہ ہو گیا۔ دہلی کالج دراصل ۱۷۹۲ء میں فیض الدین حیدر کا بنایا ایک مدرسہ تھا جہاں انگریزوں کی حکومت میں سائنس، حساب، انگریزی اور ادب سکھایا جانے لگا۔ یہاں نذیر احمد نے عربی ادب کے تراجم کیے اور دہلی کالج میں حاصل کی جانے والی تعلیمات ہی نے انہیں دنیا، فلّسفہ اور سائنس کو ایک نئے نظریے سے دیکھنے کے قابل بنایا۔ یہ اورنگ بادی مسجد اور دہلی کالج میں حاصل کردہ تعلیم ہی تھی جس نے نذیر احمد کے مستقبل کی شہرت کی بنیاد ڈالی۔

دہلی کالج میں نذیر احمد ایک دورِ تشکیک اور الحاد سے گُزرے۔ ان کے ماسٹر رام چندر نے عیسائیت قبول کر لی تھی۔ اور بقول نذیر احمد کے وہ خود بھی عیسائیت کی طرف رجحان رکھتے تھے۔ یہ ان کا تجسّس تھا جو انہیں اس طرف لے گیا مگر ان کے گہرے دینی مطالعے نے ان کا اسلام میں ایمان بحال کر دیا۔ اس اندرونی

کشمکش کا ایک مثبت نتیجہ یہ نکلا کہ نذیر احمد ایک ایسے مسلمان ثابت ہوئے جو اندھی تقلید کے قائل نہ تھے بلکہ سوچ سمجھ کر فیصلے کرنے والے تھے اور نئی حقیقتوں کے تناظر میں اسلامی تعلیمات کی تشریح کرنے سے بھی نہ گھبراتے تھے۔

ان کے گہرے مطالعہ نے انہیں ایک ایسا مصلح بنا دیا جو اپنے معاشرے اور ثقافتی اقدار سے خاصا غیر مطمئن تھا۔ ان کا ناول نگاری کا عمل بھی دراصل اسی اصلاحی جذبے کا نتیجہ ہے۔ اور خواتین کی زبوں حالی انہیں خاص طور پر رنجیدہ کرتی تھی۔

مولوی نذیر احمد جنہیں اکثر ڈپٹی نذیر احمد بھی کہا جاتا ہے ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک باصلاحیت انسان تھے۔ ناول نگار، خواتین کے حقوق کے حامی، مصلح، مترجم، مؤرخ، شاعر، دینی عالم اور سر سیّد احمد خان کے ساتھی۔ نذیر احمد اصلاحی ناول لکھتے جن کا مقصد خواتین کی تعلیم و تربیت اور گھریلو معاملات میں ان کی اصلاح کرنا تھا۔

نذیر احمد کی تصانیف

نذیر احمد کے کیے گئے تراجم اور درسیات و متفرقات میں انکم ٹیکس ایکٹ، مجموعہ قوانین تعزیرات ہند اور اصلاح ترجمہ ضابطہ، فوجداری موجود ہیں۔

ان کے ناولوں میں مراۃ العروس (۱۸۶۹ء)، توبتہ النصوح (۱۸۷۴ء)، فسانہ مبتلا (۱۸۸۵ء)، ابن الوقت (۱۸۸۸ء)، رویائے صادقہ (۱۸۹۴ء)، ایامٰی (۱۸۹۱ء)، منتخب الحکایات (۱۸۶۹ء)، چندو پند (۱۸۷۱ء)، بنات النعش (۱۸۷۳ء) موجود ہیں۔ قرآن مجید کا ترجمہ (۱۹۰۵ء) میں کیا۔

مراۃ العروس لکھنے کی وجہ

ڈپٹی نذیر احمد مراۃ العروس کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ اس دور میں خواتین کی تعلیم و تربیت کا

رواج نہ تھا۔ شریف اور معزّز خاندانوں کی بعض عورتیں قرآن مجید مع ترجمہ اور مذہبی رسالے پڑھ لیا کرتی تھیں۔ نذیر احمد کو محسوس ہوا کہ مرد حضرات کی طرح عورتوں کا بھی تعلیم کی طرف رجحان تھا مگر ان کے لیے موجود کتب اس قدر غیر دل چسپ تھیں کہ ان کی طبیعت پر ناگوار گزرتی تھیں۔ انہیں ایک ایسی کتاب کی تلاش تھی جو دل چسپ بھی ہو اور مذہبی اور گھریلو تربیت کا بھی کام سر انجام دے۔ تمام کتب خانے چھان مارے پر انہیں ایسی کسی کتاب کا پتہ نہ ملا۔ لہٰذا انھوں نے خود ہی ایک ناول لکھنے کا آغاز کر دیا جو کہ دیکھتے ہی دیکھتے خواتین میں انتہائی مشہور ہو گیا۔

مراۃ العروس (خلاصہ)

کہانی دور اندیش خاں خاندان کی دو بیٹیوں اکبری اور اصغری کی زندگیوں کے گرد گھومتی ہے جن کی شخصیات عین ایک دوسرے کے برعکس ہیں۔ اکبری اپنے والدین کی شادی کے کافی عرصہ بعد پیدا ہونے والی پہلی اولاد تھی۔ پیدائش کے فوراً بعد ہی نانی نے اسے اپنے پاس رکھ لیا۔ گھر والوں کے بے جا لاڈ پیار نے اکبری کو کسی کام کا نہ چھوڑا۔ اس کی نانی کی بے جا شہ نے اسے انتہائی ضدی بنا دیا تھا۔

اکبری کی شادی محمد عاقل سے ۱۶ برس کی عمر میں ہو جاتی ہے۔ محمد عاقل ایک سُلجھا ہوا سمجھدار لڑکا ہے۔ مگر اکبری کی بد مزاجی، ضدّی پن اور غیر ذمّہ دارانہ روّیہ اسے بھی عاجز کر دیتا ہے۔ شادی کے چند ماہ بعد ہی اکبری ضد کرنے لگی کہ میرا تمہاری ماں کے ساتھ گُزارا نہیں ہو سکتا۔ حالاں کہ اس کی ساس اس کی بہت پرواہ کرتی تھی اور اسی کی طرف داری کرتی۔ عاقل کے وجہ دریافت کرنے پر بتایا کہ ساس نے اکبری کو اپنی جاہل دوستوں کو گھر بلانے سے منع کر دیا ہے۔ محمد عاقل نے جب ان کی طرف داری کی تو وہ مُنہ پھلا کر میکے چلی گئی۔ پھر جب اپنی خالہ کے منانے پر رمضان میں گھر واپس آ بھی گئی تو تیور ویسے کے ویسے ہی رہے۔

اکبری کی چھوٹی بہن اصغری کا حال اس کے بالکل برعکس تھا۔ چوں کہ وہ تیسری اولاد تھی تو اس کی

پیدائش تک گھر والوں کے تمام ارمان پورے ہو چکے تھے۔ اس کی پرورش گھر کے بڑوں کے سائے میں ہوئی۔ وہ ایک ذمّہ دار، عقل مند اور ہنر مند لڑکی ہے۔ بچپن میں قرآن ترجمہ کے ساتھ مکمل پڑھ لیا تھا اور ابا جان کو خط بھی لکھ لیا کرتی تھی۔ اس نے انتہائی کم عمری میں گھر کا سارا نظام سنبھال لیا تھا۔

اس کی شادی عاقل کے چھوٹے بھائی محمد کامل سے ہو جاتی ہے۔ محمد کامل عام نوجوانوں کی طرح بے فکر، خوش باش اور کھیل تماشے کا شوقین ہے۔ شادی کے بعد اصغری اپنے سسرال میں اپنی ملن ساری، ہنر مندی اور ذمہ دارانہ روّیہ کی بنا پر ہر ایک کا دل جیت لیتی ہے اور جلد وہاں کا نظام بھی خود سنبھال لیتی ہے۔ اصغری محمد کامل کو بھی اچھے مشورے دے کر راہ پر لگاتی ہے اور خود بھی سماجی خدمات کے ذریعے اپنے معاشرے کا اہم رکن ثابت ہوتی ہے۔

مصنّف نے اکبری اور اصغری کی برعکس شخصیات کے ذریعے خواتین کی تعلیم و تربیت اور حسنِ اخلاق پر زور ڈالا ہے۔ ایک سمجھ دار اور تعلیم یافتہ عورت صرف اپنے ہی نہیں بلکہ اپنے تمام خاندان کے سکون کا باعث بنتی ہے جب کہ ایک جاہل اور اَن پڑھ عورت اپنے سے وابستہ ہر شخص کی زندگی اجیرن کر دیتی ہے۔

ڈرامائی تشکیل

۱۹۸۸ء میں مراۃ العروس کی کہانی پر مبنی پی ٹی وی پر مراۃ العروس نامی ڈرامہ نشر ہوا جو پرویز نواز حق نے لکھا۔ اسے شوکت زین العابدین نے پی ٹی وی کے لیے پروڈیوس اور ڈائریکٹ کیا۔ کہانی دو بہنوں اکبری اور اصغری کے گرد گھومتی ہے اور اصل کہانی سے مماثلت رکھتی ہے۔

اسی کہانی پر مبنی ایک اور ڈرامہ جو عمیرہ احمد نے لکھا اور انجم شہزاد نے ہدایت کاری کے فرائض انجام دیے، جیو پر ۲۰۱۲ء میں نشر کیا گیا۔ کہانی اکبری نواسیوں (جن کے کردار مہوش حیات اور آمنہ شیخ نے ادا کیے ہیں) اور اصغری کے نواسوں (جن کے کردار میکال ذوالفقار اور احسن خان نے ادا کیے) کے گرد گھومتی ہے، جو بعد میں ایک دوسرے

سے شادی کر لیتے ہیں۔

۲۰۱۱ء میں ہم ٹی وی پر اکبری اصغری نام کا ڈرامہ نشر ہوا جو کہ نذیر احمد کے ناول پر کسی حد تک مبنی تھا۔ یہ ایک جدید دور کی مزاحیہ تشکیل ہے جسے فائزہ افتخار نے تحریر کیا اور حسیب حسن نے ہدایات دیں۔ اس ڈرامے میں صنم بلوچ اور حمیما ملک نے اور عمران عباس اور فواد خان نے مرکزی کردار ادا کیے۔

کہانی میں دونوں بہنوں نے اپنی ساری زندگی بیرون مُلک گزاری ہے اور ان کا باپ چاہتا ہے کہ ان کی پاکستان شادی ہو جائے۔ اکبری ایک دکھاوا پسند لڑکی ہے جو والدین کو خوش کرنے کے لیے خود کو کچھ اور ظاہر کرتی ہے مگر کرتی اپنی من مانی ہی ہے۔

اس کے برعکس اصغری ایک بے باک لڑکی ہے جو دوغلا پن نہیں رکھتی۔ کہانی دونوں کے پاکستان گاؤں واپسی کے قیام کے گرد گھومتی ہے۔

تنقید

مراۃ العروس کو اردو ادب کا پہلا اصلاحی ناول کہا جاتا ہے جس میں مصنّف نے مسلم معاشرے کی اخلاقی اور تعلیمی اصلاح کو مرکزی موضوع بنایا ہے۔ تاہم اس ناول میں کردار نگاری کا انداز ایک حد تک غیر حقیقی اور مبالغہ آمیز محسوس ہوتا ہے۔ اکبری اور اصغری جو اس کہانی کے مرکزی کردار ہیں، ایک دوسرے کی مکمل ضد کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ ایک مکمل طور پر نافرمان، سست، خود غرض اور دنیادار جب کہ دوسری انتہائی بااخلاق، محنتی، دیندار اور مثالی۔ اس طرح کا تضاد کرداروں کو حقیقت سے دُور کر دیتا ہے اور انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں کو نظر انداز کرتا ہے۔ حقیقی زندگی میں انسان نہ مکمل طور پر اچھا ہوتا ہے اور نہ مکمل طور پر بُرا، بلکہ اس کی شخصیت مختلف پہلوؤں کا مجموعہ ہوتی ہے۔

اس شدّت پسندانہ تقسیم کے ذریعے مصنّف نے ایک اخلاقی سبق دینے کی کوشش تو کی ہے لیکن

کرداروں میں توازن کی کمی انہیں غیر فطری اور محض علامتی بنا دیتی ہے۔ نہ صرف یہ کہ قاری ان کرداروں سے جذباتی سطح پر جُڑنے میں مشکل محسوس کرتا ہے بلکہ یہ پیشکش خود اصلاحی مقصد کو کمزور کر دیتی ہے۔ کیوں کہ جب کردار ہی ناقابلِ یقین ہوں تو ان سے وابستہ پیغام بھی کم موثر ہو جاتا ہے۔

ناول کا مثبت پہلو

مندرجہ بالا تنقید کسی حد تک درست ہے مگر ہم کہانی کے مثبت پہلو کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اس ناول کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ نسائی کرداروں کو صرف جذبات یا مذہب کے تابع نہیں بنایا گیا بلکہ یہ ان کی عقل، فکری صلاحیت اور سماجی شعور کو مرکزی حیثیت عطا کرتا ہے۔ ناول میں اصغری کے ذریعے عورت کے تجربات کو مردانہ تجربات کے مساوی حیثیت دی گئی ہے۔ جو اس دور کے تناظر میں ایک جرأت مندانہ قدم تھا۔ اصغری کے کردار کو ایک ایسے کردار کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو نہ صرف اپنی انفرادی حیثیت کو سمجھتی ہے بلکہ اپنے اطراف کی سماجی کوتاہیوں کو بھی پہچانتی ہے اور ان کے حل کے لیے فکری مکالمے کا آغاز کرتی ہے۔

ناول میں اصغری کا کردار ایسا نمونہ ہے جو عورت کو محض قربانی دینے والی شخصیت کے طور پر نہیں بلکہ فاعل، تجزیہ کار اور تبدیلی کی خواہاں ہستی کے طور پر پیش کرتا ہے۔ نذیر احمد کا یہ اسلوب کہ وہ عورت کے کردار کو مرد کے اخلاقی نظام کے تابع کرنے کے بجائے ایک خود مختار معاشرتی وجود کے طور پر دکھاتے ہیں۔ جو کہ اس ناول کو محض اخلاقی درس نہیں بلکہ فکری و ادبی اہمیت کا حامل بنا دیتا ہے۔

❋ ❋ ❋

نمود، شمارہ ۱۴، ۲۰۲۵ء

حاجرہ مبین

لاجونتی

راجندر سنگھ بھیدی اردو ادب کے اُن چند ادیبوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے اپنی کہانیوں کے ذریعے انسانی جذبات کے نازک لمحات اور سماجی حقائق کو اِس خوبصورتی سے پیش کیا ہے کہ وہ قاری کے دِل و دماغ میں گہرے اُتر جاتے ہیں۔ بیدی، جو پروگریسو رائٹر موومنٹ کے اہم رکن تھے، انھوں نے اپنے افسانوں میں معاشرے کے زخموں کو کھول کر رکھ دیا۔ چاہے وہ عورتوں کے مسائل ہوں، طبقاتی کشمکش ہو، یا تاریخی سانحات کے اثرات۔ اُن کی مشہور کہانی "لاجونتی" اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، جو نہ صرف ایک عورت کی کہانی ہے بلکہ تقسیم ہند کے بعد کے المیے اور اس کے نتیجے میں خواتین کے ساتھ ہونے والے سلوک کی ایک دردناک تصویر بھی پیش کرتی ہے۔ یہ کہانی اپنے موضوع، کرداروں اور گہرے علامتی معنی کی وجہ سے اردو ادب میں ایک خاص مقام رکھتی ہے۔

لاجونتی کا عنوان ہی اپنے اندر ایک کہانی سمیٹے ہوئے ہے۔ لاجونتی یہ نام کہانی کے مرکزی کردار لاجونتی کی کمزوری اور معاشرے کے ہاتھوں اُس کے مسلسل زخمی ہونے کی عکاسی کرتا ہے۔ کہانی میں لاجونتی ایک ایسی عورت ہے جو تقسیم کے فسادات میں اغوا ہو جاتی ہے اور برسوں بعد اپنے شوہر سُندر لال کے پاس واپس آتی ہے لیکن یہ واپسی کوئی خوشی کا لمحہ نہیں، بلکہ ایک جذباتی خلا اور خاموشی کا آغاز ہے۔ سُندر لال، جو کبھی اُسے مارتا تھا، اب اُسے ایک الگ نظر سے دیکھتا ہے۔ "لاجونتی" کی کہانی معاشرے کی اس بے حسی کی عکاسی بن جاتی ہے جو بحالی کے نام پر عورتوں کو صرف ایک علامت بنا کر رکھ دیتے ہیں۔

اِس مضمون کا مقصد اِس کہانی کو مختلف زاویوں سے دیکھنا ہے۔ اِس کہانی کے تاریخی تناظر بھی گہری اہمیت رکھتے ہیں اور اِس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ یہ ۱۹۴۷ء کی تقسیم کے بعد کے حالات سے کِس طرح جُڑی ہے۔

لاجونتی کی اہمیت صرف اس کی کہانی میں نہیں بلکہ اُس سوال میں ہے جو یہ اُٹھاتی ہے: کیا بحالی صرف لوگوں کی واپسی ہے، یہ دِلوں کو بھی جوڑنا ضروری ہے؟ یہ کہانی ہمیں تقسیم کے ان زخموں کی یاد دلاتی ہے جو آج بھی مکمل طور پر مندمل نہیں ہوئے۔ یہ ان خواتین کی آواز ہے جو تاریخ کے اوراق میں گُم ہو گئیں، اور بیدی نے اسے سُننے اور سُنانے کی بہادرانہ کوشش کی۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا تھا، اس کہانی کی گہرائیوں کے سمجھنے کے لیے اس کے تاریخی پس منظر پر نظر ڈالنا ضروری ہے، کیوں کہ یہ کہانی ۱۹۴۷ء کی تقسیم ہند کے المناک واقعات سے گہرائی سے جڑی ہے۔ تقسیم ہند صرف ایک سیاسی واقعہ نہیں تھا۔ یہ ایک انسانی سانحہ تھا جس نے لاکھوں زندگیوں کو تہس نہس کر دیا، خاندانوں کو بکھیر دیا، اور معاشرے کے تانے بانے کو چاک کر دیا۔ اِس دور میں فسادات، ہجرت اور تشدّد نے ایسی تباہی مچائی کہ اُس کے اثرات آج بھی جنوبی ایشیاء کے لوگوں کے ذہنوں اور دِلوں میں موجود ہیں۔ لاجونتی اسی پس منظر میں ایک عورت کی کہانی بیان کرتی ہے، لیکن یہ اُن ہزاروں خواتین کی اجتماعی آواز بھی ہے جو اُس دور کے ہاتھوں کُچلی گئیں۔

تقسیم کے دوران، جب ہندوستان اور پاکستان دو الگ ملک بنے، تقریباً ایک کروڑ چالیس لاکھ لوگوں نے سرحد پار کی۔ اِس ہجرت میں فسادات نے آگ اور خون کا کھیل کھیلا۔ گاؤں جلائے گئے، قافلے لُوٹے گئے، اور لاکھوں افراد اپنی قیمتی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس افراتفری میں سب سے زیادہ متاثر خواتین ہوئیں۔ تخمینوں کے مطابق، دونوں طرف سے تقریباً ۷۵۰۰ خواتین اغوا ہوئیں۔ انھوں نے عورتوں کو گھروں سے اُٹھایا، اُن پر

تشدّد کیا گیا۔ لاجونتی، جو کہانی کا مرکزی کردار ہے، ایسی ہی عورت کی نمائندگی کرتی ہے جسے اغوا کیا گیا ہے اور برسوں بعد واپس لوٹایا گیا ہے۔ اُس کا تجربہ اس دور کی ان گنت عورتوں کی کہانیوں سے ملتا جُلتا ہے۔

تقسیم کے بعد دونوں ممالک کی حکومتوں نے اغوا شدہ خواتین کی بحالی کے لیے پروگرام شروع کیے، جنہیں ریکوری آپریشنز کہا جاتا تھا۔ ہندوستان میں مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو نے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ ان خواتین کو اپنے دلوں میں قبول کریں اور انہیں آلودہ نہ سمجھیں لیکن اس پر عمل درآمد کرنے میں بہت سے لوگ ناکام رہے۔ بہت سے لوگوں نے خود اپنی بیٹیوں اور بہنوں کو واپس لینے سے انکار کر دیا، کیوں کہ انہیں عزت کے نقصان کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ لاجونتی میں بھی سُندر لال ایک ایسی ہی کمیٹی کا حصّہ ہوتا ہے جو عورتوں کی بحالی کے لیے کام کرتی ہے، لیکن کہانی یہ ظاہر کرتی ہے کہ یہ کوشش کتنی سطحی تھی۔ لاجونتی کی واپسی کے باوجود اسے اپنے شوہر کے گھر میں جذباتی طور پر قبول نہیں کیا جاتا، جو اُس دور کے معاشرتی روّیوں کی عکاسی کرتا ہے۔

اِس تاریخی تناظر میں پنجابی ثقافت کا بھی ایک اہم کردار ہے۔ کہانی اِس تاریخی پس منظر کو ایک شاہکار بناتی ہے۔ کیوں کہ یہ نہ صرف ایک کہانی ہے، بلکہ ایک زخمی تاریخ کا آئینہ بھی ہے۔ اِس تناظر کو سمجھ کر ہی ہم کہانی کے کرداروں اور موضوعات کی گہرائی تک پہنچ سکتے ہیں۔

راجندر سنگھ بیدی کی لاجونتی ایک ایسی کہانی ہے جو اپنی سادگی اور گہرائی سے قاری کو اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہے۔ یہ کہانی سُندر لال اور اُس کی بیوی لاجونتی کے گرد گھومتی ہے، جن کی زندگی تقسیم ہند کے فسادات سے الٹ پلٹ ہو جاتی ہے۔ اس کا خلاصہ اور تجزیہ ہمیں اس کہانی کے ڈھانچے، علامتوں، اور پیغام کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ کہانی کا آغاز سُندر لال کے گھر سے ہوتا ہے، جہاں وہ اپنی بیوی لاجونتی کے ساتھ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناروا سلوک کرتا ہے۔ وہ اسے مارتا ہے اور اُس کا یہ روّیہ اس وقت کے روایتی شوہروں کی تصویر کشی کرتا ہے لیکن تقسیم کے فسادات کے دوران لاجونتی اغوا ہو جاتی ہے، اور سُندر لال اُسے کھو دیتا ہے۔ اس صدمے سے وہ بدل

جاتا ہے۔ وہ ایک کمیٹی میں شامل ہوتا ہے جو اغوا شدہ خواتین کو اُن کے گھروں تک واپس لانے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ لوگوں کو بھی یہ بات سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ ایسی سب خواتین کو اپنے دِل میں جگہ دو، برسوں بعد، جب لاجونتی واپس آتی ہے۔ صحت مند اور بدلی ہوئی۔ سُندر لال حیران رہ جاتا ہے کہ وہ پاکستان میں اچھے حال میں رہی لیکن وہ اُس سے اُس کے ماضی کے بارے میں کچھ سُننا نہیں چاہتا تھا۔

کہانی کا ڈھانچہ خطی نہیں بلکہ ایک لطیف غیر خطی انداز میں آگے بڑھتا ہے۔ بیدی نے لاجونتی کی واپسی کو مرکزی نقطہ بنایا اور اس کے ذریعے ماضی کے واقعات کو فلیش بیک میں دکھایا۔ یہ ترتیب کہانی کو ایک جذباتی گہرائی دیتی ہے کیوں کہ ہم سُندر لال کے بدلاؤ اور لاجونتی کے صدمے کو ایک ساتھ دیکھتے ہیں۔ کہانی کا اختتام کھُلا اور اُداس ہے۔ لاجونتی کا رونا اُس کے اندر دبے درد کو ظاہر کرتا ہے، لیکن کوئی حل پیش نہیں کیا جاتا۔ علامتیں اس کہانی کا اہم حصّہ ہیں۔ لاجونتی کا نام خود اس کی کمزوری اور معاشرے کے ہاتھوں اُس کے مُرجھانے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اِس کے علاوہ، سُندر لال کی مارچنگ کمیٹی، جو نعرے لگاتی ہے، بحالی کے عمل کی سطحیت کی علامت ہے۔ یہ شور تو مچاتی ہے لیکن دلوں تک نہیں پہنچتی۔ لاجونتی کی صحت مند واپسی ایک پیچیدہ علامت ہے۔ یہ بتاتی ہے کہ اُس کے کالے دنوں میں شاید کوئی کہانی چھپی ہے، لیکن اسے دبایا جاتا ہے۔

کہانی کا پیغام تلخ لیکن طاقتور ہے۔ بیدی دکھاتے ہیں کہ بحالی صرف جسموں کی واپسی تک محدود رہ گئی۔ لاجونتی گھر تو آتی ہے لیکن سُندر لال کی عزّت اور ترس اسے اجنبی بنا دیتے ہیں۔ وہ اپنے ماضی کو بتانا چاہتی ہے لیکن اُس کی آواز دبا دی جاتی ہے۔ یہ تقسیم کے بعد کے معاشرے کی تصویر ہے، جہاں خواتین کو یا تو مسترد کیا گیا یا انہیں ایک علامت بنا کر اُن کی انسانیت چھین لی گئی۔ اُس منظر کو دیکھنے کے بعد پڑھنے والے کے ذہن میں ایک سوال اُٹھتا ہے: کیا سچائی کو سُنے بغیر بحالی ہو سکتی ہے؟

اگر کرداروں کی بات کی جائے تو اِس کہانی کے کردار نہ صرف کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں بلکہ تقسیمِ ہند

کے بعد کے سماجی اور جذباتی زخموں کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔

سُندر لال کہانی کا ایک اہم کردار ہے، جو اپنے تضادات کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ کہانی کے شروع میں وہ ایک روایتی شوہر ہے، جو اپنی بیوی کو مارتا ہے اور اُسے اپنی ملکیت سمجھتا ہے لیکن جب وہ اغوا ہو جاتی ہے، سُندر لال میں ایک تبدیلی آ جاتی ہے۔ یہ تبدیلی اُس کے جُرم اور نقصان کے احساس سے جنم لیتی ہے۔ وہ اپنے ماضی کے سلوک کو درست کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور لاجونتی، اِس کہانی کی روح ہے۔ ایک ایسی عورت جو اپنی خاموشی سے بہت کچھ کہہ جاتی ہے۔ اغوا کے بعد وہ صحت مند تو ضرور واپس آئی ہے، لیکن اُس کی خاموشی اُس کے اندر کے صدمے کی گواہی دیتی ہے۔ اُس کی یہ خاموشی صرف اُس کی ذاتی کہانی نہیں، بلکہ اُن ہزاروں خواتین کی آواز ہے جو تقسیم کے بعد معاشرے کے ہاتھوں دبا دی گئی۔

اِس کہانی کے موضوعات نہ صرف قاری کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں بلکہ تقسیمِ ہند کے زخموں کو محسوس کرنے کا موقعہ بھی دیتے ہیں۔ اِس کہانی کے موضوعات جیسے کہ خاموشی اور صدمہ، اور مردانہ بحالی، اِسے ایک لازوال ادبی تخلیق بناتے ہیں۔

لاجونتی کا سب سے نمایاں موضوع خاموشی ہے، جو کہانی کے ہر لمحے میں موجود ہے۔ لاجونتی کی واپسی کے بعد سُندر لال اُسے اپنے گزارے ہوئے دِنوں کے بارے میں بولنے سے روکتا ہے۔ لیکن یہ خاموشی اُس کے لیے ایک بوجھ بن جاتی ہے، جس کی وجہ سے وہ رو بھی پڑتی ہے۔ بیدی، اِس خاموشی کو محض ایک کردار کی حالت نہیں، بلکہ معاشرے کی اُس روش کی علامت بتاتے ہیں جو تقسیم کے بعد خواتین کے درد کو سُننا نہیں چاہتا تھا۔

کہانی مردانہ بحالی پر ایک گہری تنقید پیش کرتی ہے۔ سُندر لال، جو پہلے لاجونتی کو مارتا تھا، اُس کو واپس لانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن یہ تبدیلی اُس کی اپنی شرمندگی اور جرم کے احساس سے زیادہ جُڑی ہے۔ وہ لاجونتی کی کہانی سُننے کی بجائے اُسے خاموش رکھتا ہے، جو اُسے ایک انسان سے زیادہ ایک علامت بنا دیتا ہے۔ یہ

موضوع اس وقت کے معاشرے کی عکاسی کرتا ہے، جہاں مردوں نے خواتین کی بحالی کے عمل کو کنٹرول کیا۔ چاہے وہ انہیں مسترد کر کے ہو یا انہیں عزت دے کر اُن کی آواز چھین کر۔ بیدی اِس کے ذریعے دِکھاتے ہیں کہ ایسی بحالی نامکمل اور ظالمانہ ہے۔

راجندر سنگھ بیدی کی لاجونتی نہ صرف اپنے موضوعات اور کرداروں کی وجہ سے حیرت انگیز دکھتی ہے بلکہ اُس کے اسلوب اور زبان نے بھی اسے اردو ادب میں ایک ممتاز مقام دیا ہے۔ بیدی کا انداز سادہ لیکن گہرا ہے، جو کہانی کے جذباتی اور سماجی پیغام کو بغیر کسی تصنّع کے قاری تک پہنچاتا ہے۔

اُن کا اسلوب بنیادی طور پر واقعاتی یا حقیقت پسندانہ ہے جو پروگریسو رائیٹرز موومنٹ کے اثرات کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ کہانی کو بے جا جذباتیت یا ڈرامے سے دُور رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر لاجونتی کی واپسی کے لمحے کو بیدی نے نہایت سادگی سے بیان کیا۔ اِسی طرح، کہانی کا اختتام، جہاں لاجونتی روتی ہے، کوئی لمبا مکالمہ یا وضاحت نہیں، صرف ایک خاموش درد کہانی کے صدمے کو اور گہرا کرتا ہے۔ اور قاری خود اُس کو محسوس کرتا ہے۔

بیدی نے خاموشی کو نہ صرف ایک موضوع کے طور پر، بلکہ اپنے اسلوب کے حصّے کے طور پر بھی استعمال کیا۔ لاجونتی کی بات نہ کرنے کی کیفیت کہانی کے ڈھانچے میں جھلکتی ہے۔ اس کے تجربات کو بیان نہیں کیا جاتا، بلکہ اُن کی موجودگی کو محسوس کرایا جاتا ہے۔

اِس کے علاوہ، بیدی کی زبان اور اسلوب میں پروگریسو رائٹر کا اثر واضح ہے۔ وہ سماجی مسائل، خواتین کی بے آوازی، مردانہ تعصّب، اور بحالی کی ناکامی کو تنقیدی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اُن کی زبان معاشرے کے منافقانہ روّیوں کو بے نقاب کرتی ہے۔

راجندر سنگھ بیدی کی لاجونتی ایک ایسی کہانی ہے جو اپنے موضوعات، کرداروں اور اسلوب کے ذریعے تقسیم ہند کے زخموں کو نہ صرف دکھاتی ہے بلکہ انہیں محسوس کرنے پر بھی مجبور کرتی ہے۔

لاجونتی کی اہمیت اس میں ہے کہ یہ تقسیم کے ان پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے جو اکثر تاریخ کے شور میں گُم ہو گئے۔ خواتین کے صدمات، اُن کی دبی ہوئی آوازیں اور اُن کی کھوئی ہوئی شناخت۔ بیدی نے اِس کہانی کے ذریعے اردو ادب میں ایک لازوال اضافہ کیا، جو نہ صرف ایک عورت کی کہانی ہے، بلکہ ایک زخمی معاشرے کا آئینہ بھی۔ ان کی میراث اسی سچائی اور ہمدردی میں جھلکتی ہے جو لاجونتی کو آج بھی زندہ رکھتی ہے۔

آخری خیال کے طور پر، یہ کہانی ہمیں ایک سوال دیتی ہے: کیا ہم ان خاموش آوازوں کو سُننے کے لیے تیار ہیں جو ماضی میں دب گئیں؟ لاجونتی ہمیں بتاتی ہے کہ سچ سُننا اور درد کو قبول کرنا ہی بحالی کا اصل راستہ ہے۔ یہ نہ صرف ایک ادبی تخلیق ہے، بلکہ ایک دعوت ہے، سمجھنے، محسوس کرنے، اور سُنا دینے کی۔

❋ ❋ ❋

فاطمہ عمران

منٹو: فحاشی یا فکری بغاوت

پیدائش اور ابتدائی زندگی

سعادت حسن منٹو ۱۱ مئی ۱۹۱۲ء کو برطانوی ہندوستان کے ضلع لدھیانہ (پنجاب) کے قصبے سمرالہ میں ایک کشمیری گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مولوی حسن پیشے سے جج تھے اور طبیعت کے انتہائی سخت گیر سمجھے جاتے تھے۔ جب کہ والدہ سردار بیگم نرم دل اور شفیق تھیں۔ منٹو اپنی ماں سے بے حد قربت رکھتے تھے مگر والد کی سخت مزاجی کی وجہ سے باپ کی محبت اور شفقت سے محروم رہے۔ بچپن میں منٹو غیر معمولی طور پر شرارتی واقع ہوئے تھے۔ رسمی تعلیم میں دل نہ لگنے کے باعث تعلیمی میدان میں کارکردگی شروع سے ہی کمزور رہی۔ میٹرک کے امتحانات میں انہیں مسلسل ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا یہاں تک کہ بالآخر ۱۹۳۱ء میں چوتھی کوشش میں بمشکل تیسری ڈویژن میں میٹرک پاس کیا۔ دل چسپ بات یہ کہ اردو مضمون میں وہ اس بار بھی ناکام رہے تھے۔ اور پھر ۱۹۳۳ء میں ایم۔اے۔او کالج میں داخلہ لیا۔ تاہم ۱۹۳۴ء میں پنجاب یونیورسٹی کے ایف۔اے کے امتحان میں فیل ہو گئے۔ ۱۹۳۵ء میں علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ ملا مگر شروع میں ہی تپ دق (ٹی بی) کی غلط تشخیص کے باعث یونیورسٹی نے انہیں واپس بھیج دیا گیا۔ اگرچہ منٹو باضابطہ تعلیم حاصل نہ کر سکے لیکن بچپن سے ہی انہیں کتب پڑھنے کا شوق ضرور تھا اور وہ روایتی نصاب کے بجائے خود سے مطالعہ کر کے علم حاصل کرنا چاہتے تھے۔ یہ خود سری اور روایت شکنی کا عنصر ان کی ابتدائی شخصیت میں نمایاں تھا اور مستقبل میں انہی خصوصیات نے ان کی ادبی راہ بنائی۔

ادبی سفر کا آغاز

منٹو کی ذہنی نشوونما اور ادبی دل چسپی پروان چڑھانے میں عبدالباری علیگ کا بڑا کردار تھا۔ امرتسر کے مشہور ہوٹل شیراز میں منٹو کی ملاقات باری علیگ سے ہوئی جو اُس وقت اخبار ''مساوات'' کے مدیر تھے۔ باری علیگ نے منٹو کے اندر چھپی قابلیت کو پہچانا اور انتہائی خلوص سے انہیں صحافت اور ادب کی طرف مائل کیا۔ انھوں نے منٹو کو تیرتھ رام فیروز پوری جیسے سطحی ناول چھوڑ کر آسکر وائلڈ اور وکٹر ہیوگو کی کتب پڑھنے کی ترغیب دی۔ منٹو بعد میں اعتراف کرتے تھے کہ اگر باری صاحب نہ ملتے تو شاید وہ جرائم کی دنیا میں گم نام موت مر جاتے۔ باری علیگ کی ہی فرمائش پر منٹو نے صرف دس پندرہ دن میں وکٹر ہیوگو کے ناول *The Last of a Condemned Man* کا اردو ترجمہ سرگزشت اسیر کے نام سے کر ڈالا۔ اس پہلی کاوش کی ادبی حلقوں میں پذیرائی ہوئی اور یوں منٹو ۲۱ سال کی عمر میں باقاعدہ صاحب کتاب بن گئے۔ اسی زمانے میں (لگ بھگ ۱۹۳۴ء کے) باری علیگ کے اشتراک سے رسالہ خلق کے پہلے شمارے میں منٹو کا پہلا افسانہ ''تماشہ'' شائع ہوا۔ یہ افسانہ جلیانوالہ باغ کے قتلِ عام کے سانحہ سے متاثر ہو کر لکھا گیا تھا اور منٹو کے جارحانہ اور حقیقت پسندانہ اسلوب کا ابتدائی نمونہ تھا۔ ۱۹۳۶ء تک منٹو ادبی حلقوں میں ایک ابھرتے ہوئے افسانہ نگار کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے تھے۔

بمبئی میں ادبی اور فلمی زندگی

۱۹۳۵ء میں منٹو روزگار اور شہرت کی جستجو میں بمبئی چلے گئے۔ وہاں ایک ہفتہ وار جریدے پارس میں محض ۴۰ روپے ماہوار پر ملازمت کا آغاز کیا (اگرچہ ملتے صرف ۱۰، ۱۵ روپے ہی تھے)۔ کچھ عرصے بعد وہ نذیر لدھیانوی کے ہفت روزہ مصوّر کے مدیر مقرر ہوئے۔ بمبئی میں قیام کے دوران منٹو نے اردو رسائل ہمایوں اور عالمگیر کے لیے روسی ادب نمبر بھی مرتب کیے، جس سے اُن کے مطالعے کی وسعت اور ترجمہ کی صلاحیت کا اعتراف ہوا۔ اسی اثنا میں فلمی دنیا کی طرف بھی رجحان بڑھا۔ انھوں نے چند فلم کمپنیوں (مثلاً امپیریل اور

سروج) میں مختصر مدت کے لے کہانیاں اور منظر نامے لکھے، پھر بمبئی کی ایک نئی اسٹوڈیو "سنی ٹون" میں ۱۰۰ روپے ماہوار پر بطور اسکرپٹ رائٹر ملازمت اختیار کر لی۔ یہی وہ معاشی استحکام تھا جس کے بل بوتے پر ان کی شادی کا اہتمام ہوا۔ اپنی والدہ کی مرضی سے ۱۹۳۹ء میں منٹو کا نکاح ایک کشمیری لڑکی صفیہ سے کر دیا گیا حالاں کہ نکاح سے قبل انھوں نے اپنی دلہن کو دیکھا تک نہ تھا۔ "ریختہ"

صفیہ بیگم سے منٹو کو تین بیٹیاں ہوئیں نصرت، نُزہت اور نگہت۔ بد قسمتی سے منٹو کے آزاد مزاج اور بُری شہرت کے باعث کئی رشتہ داروں نے ان سے قطع تعلق کر لیا۔ حتّٰی کہ ان کی اپنی بہن (جو اسی شہر بمبئی میں رہتی تھیں) بھی نکاح میں شریک نہ ہوئیں۔

بہر حال ازدواجی زندگی کے ابتدائی ایام کے ساتھ ساتھ منٹو کے کیریئر میں بھی پیش رفت جاری رہی۔ بمبئی میں قیام کے دوران ہی انھوں نے ریڈیو ڈرامے لکھنے شروع کیے۔ ۱۹۴۰ء میں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں انہیں باقاعدہ ملازمت مل گئی۔ جہاں مشہور شاعر ن۔م راشد، افسانہ نگار کرشن چندر اور اوپندر ناتھ اشک بھی اسٹاف کا حصّہ تھے۔ منٹو نے ریڈیو کے لیے ایک اندازے کے مطابق سو سے زائد ڈرامے اور فیچر لکھے۔ ان میں ان کا مشہور سلسلہ "قصّہ کہانی" بھی شامل ہے۔ ریڈیو کی ملازمت کے دوران منٹو کے اندرون خانہ بعض ساتھیوں سے تخلیقی اختلافات بھی اُبھرے۔ اپنی اصول پسندی کے باعث وہ اپنی تحریر میں ترمیم برداشت نہیں کرتے تھے۔ ایک بار ان کے ڈرامے میں بلا اجازت تبدیلی کی گئی تو بھرے اجلاس میں انھوں نے سخت احتجاج کیا۔ جب ان کی بات نہ مانی گئی تو طیش میں آکر منٹو نے ریڈیو کی نوکری کو لات مار دی اور واپس بمبئی لوٹ گئے۔

دوبارہ ممبئی پہنچ کر منٹو نے فلمی دنیا میں قسمت آزمائی کی۔ مشہور ہدایت کار شوکت رضوی کی فلم "نوکر" کے مکالمے لکھنے شروع کیے مگر جب انہیں محسوس ہوا کہ شوکت رضوی متوازی طور پر دوسروں سے بھی مکالمے لکھوا رہے ہیں تو انا کے مجروح ہونے پر یہ کام ترک کر دیا۔ بعد ازاں وہ ۱۰۰ روپے ماہوار پر فلمستان

اسٹوڈیو سے منسلک ہو گئے جہاں ان کی دوستی معروف اداکار اشوک کمار سے ہو گئی۔ اشوک کمار نے جب بمبئی ٹاکیز اسٹوڈیو کا انتظام سنبھالا تو منٹو بھی ان کے ساتھ وہاں چلے گئے۔ یہ وہ دور تھا جب منٹو فلمی دنیا کے ساتھ ساتھ ادبی حلقوں میں بھی مقام بنا چکے تھے اور بالی ووڈ کی چکا چوند زندگی کے پس پردہ تلخ حقائق کو کہانیاں اور خاکوں کی صورت قلم بند کر رہے تھے۔

ہجرت: قیامِ پاکستان کے بعد

۱۹۴۷ء میں برصغیر کی تقسیم کا طوفان اُٹھا تو منٹو کی زندگی بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ فسادات کے دوران بمبئی کی فضا شدید کشیدہ ہو چکی تھی۔ ان کی اہلیہ صفیہ لاہور اپنے رشتہ داروں سے ملنے گئی ہوئی تھیں اور بلووں کے باعث وہیں محصور ہو کر رہ گئیں۔ ادھر فلمی حلقوں میں بھی منٹو کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑا، جب بمبئی ٹاکیز میں اشوک کمار نے ایک فلم کے لیے منٹو کی کہانی کو رد کر کے کسی اور کا اسکرپٹ منتخب کر لیا۔ ان حالات نے منٹو کو اندر سے بے حد دلگیر کر دیا۔ چناں چہ ایک روز انھوں نے کسی کو کچھ بتائے بغیر بحری جہاز کے ذریعے بمبئی کو خیر باد کہا اور نئے قائم ہونے والے ملک پاکستان ہجرت کر آئے۔ جنوری ۱۹۴۸ء میں منٹو لاہور پہنچے، تو ابتدائی طور پر ادبی حلقوں نے ان کا خیر مقدم کیا، مگر جلد ہی انہیں احساس ہو گیا کہ یہاں آزادیِ اظہار کی راہ پہلے سے زیادہ دشوار ہے۔

پاکستان پہنچنے کے محض چند ماہ بعد ہی ان کا مشہور افسانہ ''ٹھنڈا گوشت'' رسالہ سویرا میں شائع ہوا جس پر حکومت نے فحاشی کا الزام لگا کر مقدمہ دائر کر دیا۔ ۱۹۴۹ء میں عدالت نے اس الزام میں منٹو کو تین ماہ قید اور ۳۰۰ روپے جرمانے کی سزا سنائی۔ اس واقعے نے ادبی دنیا کو ہلا کر رکھ دیا، مگر بدقسمتی سے پاکستان کے ادیبوں نے منٹو کا ساتھ نہ دیا۔ کسی بڑے پیمانے پر احتجاج کے بجائے کئی لوگ الٹا خوش تھے کہ منٹو کو ''سبق'' مل گیا۔ حالاں کہ اس سے قبل منٹو پر ایسے ہی الزامات برطانوی دور میں بھی لگ چکے تھے۔ ان کے افسانوں ''کالی شلوار''،

''دھواں'' اور ''بُو'' پر مقدمات قائم ہوئے تاہم وہ بالآخر بری ہو گئے تھے۔

مدیر سویرا اور دیگر گواہوں کی کاوش سے ''ٹھنڈا گوشت'' کیس میں اعلیٰ عدالت سے منٹو کو رہائی مل گئی۔ مگر مقدمات اور سماجی تنقید کے مسلسل دباؤ نے انہیں اندر سے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ مقدمے کے بعد کے عرصے میں منٹو شدید ذہنی دباؤ، مایوسی اور مالی پریشانیوں کا شکار ہو گئے۔ لاہور میں دوست احباب نے ان کی بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کر ایک بار اُنہیں پاگل خانے (میو ہسپتال کے نفسیاتی وارڈ) میں داخل کروادیا۔ اس کسمپرسی کے زمانے میں شراب ان کی زندگی کا مقصد بن گئی اور روزگار برائے نام رہ گیا۔ کہانیاں ہی ان کا واحد سہارا تھیں جنہیں وہ اخبار والوں کے ہاتھ محض بیس بیس روپے میں فروخت کرنے پر مجبور تھے۔ حالات یہاں تک پہنچ گئے کہ منٹو ہر جان پہچان والے سے شراب کے پیسے ادھار مانگتے نظر آتے۔ گھریلو زندگی بھی شدید متاثر ہوئی۔ گھر میں فاقوں کی نوبت آگئی۔ ایک موقع پر ان کی ننھی بیٹی ٹائیفائیڈ میں مبتلا ہو گئی اور دوا خریدنے تک کے پیسے موجود نہ تھے۔ مجبوراً ان کی بیوی نے پڑوسی سے رقم ادھار لی اور منٹو کو دی تاکہ وہ دوا لے آئیں، مگر وہ دوا خریدنے کے بجائے شراب کی بوتل لے آئے۔ اس واقعے نے صفیہ بیگم کے دل پر گہری چوٹ لگائی اور منٹو بھی اندر سے شرمندہ تھے مگر نشے کی لت سے چھٹکارا نہ پا سکے۔ ان کی صحت روز بروز گرتی چلی گئی یہاں تک کہ جگر ناکارہ ہو گیا۔

منٹو کو اپنی زندگی کے اختتام کا کسی حد تک ادراک ہو چکا تھا۔ ۱۸ اگست ۱۹۵۴ء کو انھوں نے اپنے ایک دوست ظفر زبیری کی یادداشت بک میں اپنا مشہورِ زمانہ ''فرضی کتبہ'' تحریر کیا:

یہاں سعادت حسن منٹو دفن ہے

اس کے سینے میں افسانہ نگاری کے سارے اسرار و رموز دفن ہیں۔

وہ اب بھی منوں مٹی کے نیچے سوچ رہا ہے کہ وہ بڑا افسانہ نگار ہے یا خدا۔

اس خود لکھے گئے کتبے کے ذریعے منٹو نے اپنی انفرادیت اور بے باکی کو امر کر دیا۔ اسی طرح ایک اور

موقع پر انھوں نے لکھا:

> اگر میری موت کے بعد میری تحریروں پر ریڈیو اور لائبریریوں کے دروازے کھول دیے جائیں اور میرے افسانوں کو وہی رتبہ دیا جائے جو اقبال مرحوم کے شعروں کو دیا جارہا ہے، تو میری روح بے حد بے چین ہو گی..... ذلیلو! مجھے معلوم ہے کہ میرے مرنے کے بعد تم میری تحریروں کو اسی طرح بوسے دو گے جیسے مقدس صحیفوں کو..... لیکن لعنت بھیجتا ہوں تمہاری اس قدر دانی پر۔ مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

بالآخر ۱۷ جنوری ۱۹۵۵ء کی شب منٹو شراب کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔ اسی رات شدید علالت کے باعث انہیں خون کی قے ہوئی اور طبیعت بگڑ گئی۔ ڈاکٹر نے اسپتال لے جانے کا مشورہ دیا تو کمزور آواز میں بولے :"اب بہت دیر ہو چکی ہے، مجھے ہسپتال نہ لے جاؤ۔" پھر نیم بے ہوشی کی حالت میں اپنے بھانجے سے سرگوشی کی:"میرے کوٹ کی جیب میں ساڑھے تین روپے ہیں، ان میں کچھ پیسے ملا کر مجھے وہسکی لے دو۔" گھر والوں نے آخری فرمائش پوری کی۔ منٹو نے نقاہت کے عالم میں دو گھونٹ وہسکی پی، مگر پھر تکلیف سے کراہنے لگے اور بے سُدھ ہو گئے۔ ایمبولینس بلائی گئی اور راستے میں انھوں نے دم توڑ دیا۔ یوں ۱۸ جنوری ۱۹۵۵ء کی صبح، صرف ۴۲ برس کی عمر میں، یہ بے باک افسانہ نگار زندگی کی قید سے آزاد ہو گیا۔ لاہور کے میانی صاحب قبرستان میں سعادت حسن منٹو کی تدفین عمل میں لائی گئی۔ افسوس کا مقام ہے کہ وفات کے بعد بھی کئی دہائیوں تک منٹو کو سرکاری یا عوامی سطح پر وہ پذیرائی نہ مل سکی جس کے وہ حقدار تھے۔ یہاں تک کہ ان کی آخری آرام گاہ بھی گُم نام تھی۔ تاہم، بعد از مرگ رفتہ رفتہ ادبی حلقوں اور عوام نے منٹو کی عظمت کو پہچانا اور آج انہیں اردو اُفق کا درخشاں ستارہ تسلیم کیا جاتا ہے۔

ادبی مقام اور نظریاتی رجحان

سعادت حسن منٹو اردو افسانے کی تاریخ میں عہد ساز اور منفرد ترین افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ اپنی ۲۰ سالہ ادبی زندگی میں منٹو نے ۲۷۰ کے قریب افسانے لکھے، ۱۰۰ سے زائد ریڈیو ڈرامے تحریر کیے، فلموں کے لیے کہانیاں اور مکالمے قلم بند کیے اور بیسیوں نامور و گم نام شخصیات کے خاکے تخلیق کیئے۔

منٹو کی خاصیت یہ تھی کہ انھوں نے معاشرے کے ان پہلوؤں اور کرداروں کو کہانی کا موضوع بنایا، جنہیں عام طور پر نظر انداز کیا جاتا تھا یا ادب میں جگہ نہیں ملتی تھی۔ طوائف، جسم فروشی، فسادی، پاگل، نشئی، ایسے تمام کردار جنہیں سماج اچھوت سمجھتا تھا، منٹو کے ہاں مرکز کہانی بن گئے۔ چناں چہ منٹو کے ہاں کردار انسان کی منافقت، ہوس اور بے بسی کی چلتی پھرتی تصویریں ہیں۔

منٹو نے جس دور میں لکھنا شروع کیا وہ ترقی پسند تحریک کا زمانہ تھا اور وہ مارکسی نظریات سے یکسر ناواقف بھی نہیں تھے۔ لیکن یہ کہنا درست ہو گا کہ منٹو کسی خاص نظریاتی فکر میں ڈھل کر نہیں رہے۔ وہ ترقی پسند تحریک سے متاثر ضرور ہوئے مگر اس کے رنگ میں رنگے نہیں گئے۔ ان کی ترجیح ان کا انفرادی تخلیقی اظہار تھا جسے انھوں نے ہمیشہ زندہ رکھا، یہی وجہ ہے کہ منٹو کے افسانوں کو خالص سیاسی یا انقلابی ادب کہنا مناسب نہیں ہو گا۔

اپنے اسی بے باک اسلوب کے سبب منٹو زندگی میں تنازعات کا شکار بھی ہوئے۔ قدامت پسند طبقے نے انہیں ''فحش نگار'' کہہ کر مطعون کیا، ان پر پابندیاں لگیں اور مقدمات چلے۔ وہ انسانی فطرت اور سماجی گھناؤنے پن کو اس طرح بے نقاب کرتے تھے کہ قاری لرز کر رہ جاتا ہے۔ منٹو نے خود اپنے دفاع میں ایک موقع پر کہا:

> میں تہذیب و تمدن اور سوسائٹی کی چولی کیا اتاروں جو پہلے سے ہی اُتری ہے۔ لوگ مجھے سیاہ قلم کہتے ہیں لیکن میں تختۂ سیاہ پر کالی چاک سے نہیں لکھتا بلکہ سفید چاک استعمال کرتا ہوں تاکہ تختۂ سیاہ کی سیاہی اور بھی نمایاں ہو جائے۔

یعنی منٹو انسان کو اس کے اصلی، ارضی روپ میں پیش کرتے ہیں جس میں بلندی اور پستی دونوں رنگ موجود ہیں۔

منٹو کی تحریروں میں فحاشی کے الزامات کے جواب میں ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی لکھتے ہیں:

> بعض لوگوں کا اعتراض ہے کہ منٹو کے افسانے سِفلی جذبات کو بھڑکاتے ہیں۔ اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ اگر کسی شخص کے سفلی جذبات قوتِ برداشت کی آخری حد پر ہوں تو جنس کا نام آتے ہی مشتعل ہو سکتے ہیں یوں اس میں منٹو کے افسانوں کا کیا دوش۔

حقیقت یہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ منٹو کے خلاف فحاشی کا شور ماند پڑ گیا اور ان کی بے باکی ہی ان کی پہچان بن گئی۔

افسانہ "کھول دو" خلاصہ اور تجزیہ

پس منظر اور خلاصہ

"کھول دو" سعادت حسن منٹو کا ایک نہایت چونکا دینے والا اور شُہرہ آفاق افسانہ ہے جو برِ صغیر کی تقسیم کے دوران ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کے پس منظر میں لکھا گیا۔ یہ افسانہ جس پر منٹو کے خلاف فحاشی کا مقدمہ دائر ہوا۔ اگرچہ اپنے زمانے میں بعض حلقوں نے اسے "فحش" اور "اشتعال انگیز" قرار دے کر ہدفِ تنقید بنایا لیکن آج ادبی دنیا میں "کھول دو" کو تقسیم کے انسانیت سوز المیے کی بہترین عکاسی کرنے والی کہانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

اس افسانے کی کہانی کا پلاٹ ایک بوڑھے باپ سراج الدین اور اس کی جوان بیٹی سکینہ کے گرد گھومتا ہے۔ کہانی کا آغاز فسادات کے ایک دلخراش منظر سے ہوتا ہے لوگ جان بچا کر ہجرت کر رہے ہیں۔ سراج الدین ایک امدادی ٹرین کے ذریعے اپنے خاندان سمیت پاکستان کی سمت روانہ ہوتا ہے۔ اسی ہجرت کے دوران سراج

اپنی بیٹی سکینہ سے بچھڑ جاتا ہے۔ کئی دنوں کی تڑپ اور تلاش کے بعد وہ اسے نیم مردہ حالت میں ایک ہسپتال میں پاتا ہے۔ ڈاکٹر جب نرس سے کہتا ہے "کھول دو" تو سکینہ لاشعوری طور پر اپنی شلوار ڈھیلی کر دیتی ہے۔ یہ منظر اس پر گزرے جنسی تشدد کی لرزہ خیز گواہی بن جاتا ہے۔ اس ایک لمحے میں منٹو نے یہ بیان کر دیا کہ عورت، جنگ اور سماجی بھیانک چہرے ایسے آئینے ہیں جس میں دیکھنا آسان نہیں۔

مرکزی خیال اور اہم موضوعات

"کھول دو" کا بنیادی موضوع عصمت دری اور تشدّد کے ذریعے تقسیم کے المیے کو اجاگر کرنا ہے۔ یہ افسانہ انسان کی حیوانیت اور اخلاقی گراوٹ کو انتہائی بے باکی سے دکھاتا ہے جو ہنگاموں اور فسادات میں بے لگام ہو جاتی ہے۔

منٹو نے اس کہانی میں واضح کیا ہے کہ جب معاشرے پر جنون سوار ہو جائے تو اخلاقیات، مذہب اور قانون سب دھرے رہ جاتے ہیں اور صرف درندگی کا راج قائم ہو جاتا ہے۔ سکینہ ایک مسلمان لڑکی ہے جس کے ساتھ ظلم کرنے والے بھی مسلمان رضاکار ہی ہیں جو اپنی ذمہ داری اور فرض کو بھول کر ہوس کا شکار ہو جاتے ہیں یہ بات اس کہانی کو عام فرقہ وارانہ قصّوں سے ممتاز کرتی ہے جہاں ظلم ہمیشہ مخالف فرقے کے ہاتھوں ہوتا دکھایا جاتا ہے۔ منٹو ہمیں یہ تلخ حقیقت دکھاتے ہیں کہ فساد اور جنگ میں اپنے اور پرائے کی تمیز ختم ہو جاتی ہے اور انسان ہر حد پار کر جاتا ہے۔ اس لحاظ سے "کھول دو" تقسیم ہند کے یک رخی بیانیے کا مقابلہ کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ اس دور میں ایک طبقہ مظلوم اور ایک ظالم نہیں تھا بلکہ ہر طرف درندگی تھی۔

"کھول دو" کا دوسرا اہم موضوع عورت کی عصمت اور سماج کا منافقانہ روّیہ ہے۔ تقسیم کے فسادات میں ہزاروں لڑکیاں اغوا اور زیادتی کا شکار ہوئیں۔ منٹو نے سکینہ کے کردار کے ذریعے اس اجتماعی سانحے کو علامتی حیثیت دے دی ہے۔ سکینہ اپنے باپ کی عزّت کی نشانی تھی جسے وہ پاکستان کی سرزمین پر باحفاظت پہنچانا چاہتا تھا،

مگر اس سفر میں اس لڑکی کو جنسی تشدّد کا نشانہ بنا کر جس بے رحمی سے پامال کیا گیا، اس نے عزت کے تصوّر کو تار تار کر کے رکھ دیا تھا۔ منٹو معاشرے کے اس دوغلے رویّے پر کاری ضرب لگاتے ہیں جہاں ایک طرف عورت کو ناموسِ قوم کا درجہ دیا جاتا ہے اور دوسری طرف افراتفری میں اسی کی حرمت سب سے پہلے پامال ہوتی ہے۔ سکینہ کی خاموشی اور نیم مردہ حالت پورے معاشرے کے ضمیر پر سوالیہ نشان ہیں۔ یہ کہانی ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم سوچیں ایسی نوبت کیوں آئی؟ عورت کو ہمیشہ ہمدردی یا غیرت کے نام پر نشانہ ہی کیوں بنایا جاتا ہے؟ منٹو کا فن یہ ہے کہ وہ ان سوالات کا جواب کہانی میں براہِ راست نہیں دیتے بلکہ قاری کو جھنجھوڑ کر خود احساس دلانے پر مجبور کرتے ہیں۔

اس افسانے کا عنوان "کھول دو" بھی اپنے اندر کئی معنی لیئے ہوئے ہے۔ بظاہر یہ دو لفظی سادہ جملہ ڈاکٹر کا ہے جو کھڑکی کھولنے کا حکم دیتا ہے، لیکن اسی جملے کو جب سکینہ سنتی ہے تو اس کے معنی بالکل تبدیل ہو جاتے ہیں۔ وہ مشینی انداز میں اپنا ازار بند کھولنے لگتی ہے کیوں کہ گزشتہ کچھ دنوں میں اس کے لیے یہی الفاظ بار بار بھیڑیوں کے مُنہ سے نکلے تھے۔

"کھول دو" سکینہ کے لیے حکم نہیں بلکہ ایک بھیانک یاد بن چُکا تھا جسے سُنتے ہی اس کی ذہنی حالت جواب دے جاتی ہے اور وہ غیر ارادی طور پر خود کو انہی درندوں کے حوالے کرنے کا اقدام کرتی ہے جن کی ہوس کا نشانہ بن چکی تھی۔ لہٰذا "کھول دو" کا اخلاقی پیغام اسی میں ہے کہ اس کہانی کو محسوس کریں، اس کی اذیّت کو سمجھیں اور خود احتسابی کریں۔ ایسے حالات میں ہماری انسانیت کہاں کھو جاتی ہے۔ منٹو کا قلم ہمیں آئینہ دکھاتا ہے کہ جب بھی معاشرے پر جنون طاری ہو گا، سب سے پہلے کمزور اور معصوم لوگ خصوصاً عورتیں، ظلم کا شکار ہوں گی۔

ذاتی رائے اور تاثّرات

بحیثیت ایک طالب علم، "کھول دو" میرے لیے صرف ایک کہانی نہیں بلکہ ایک لرزہ خیز تجربہ ہے۔

جب میں نے پہلی بار یہ افسانہ پڑھا تھا تو اختتام تک پہنچتے پہنچتے مجھ پر سکتہ طاری تھا۔ ''کھول دو'' پڑھ کر مجھے یہ احساس ہوا کہ منٹو نے تقسیم کے سانحے کو بیان کرنے کے لیے کسی مُرصّع زبان یا جذباتی وعظ کا سہارا نہیں لیا بلکہ سادہ بیانیہ میں ایسی کاری ضرب لگائی ہے کہ روح تک اُتر جاتی ہے۔ بطور انسان، اس کہانی کو پڑھ کر میرے اندر شرمندگی، افسوس اور ہمدردی کے ملے جلے جذبات پیدا ہوئے۔

میرے نزدیک منٹو کی مہارت یہی ہے کہ وہ لفظوں سے پڑھنے والے کے دل میں اتر کر اس کی سوچ کو جھنجھوڑ دیتے ہیں۔ سکینہ کے عبرت ناک انجام کو پڑھ کر انسان خود سے سوال کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کیا ہماری اخلاقی قدریں محض دکھاوا ہیں؟ یہ افسانہ پڑھ کر مجھے محسوس ہوا کہ ہمیں بطور معاشرہ اپنے ''چمکدار لباس'' کے نیچے چھُپے تاریک دھبّوں کو تسلیم کرنا چاہیئے کیوں کہ انہی کو جھٹلانے سے بار بار سانحات جنم لیتے ہیں۔

''کھول دو'' پر ناقدین کی آراء

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ''کھول دو'' کو ادبی نقادوں اور قارئین نے نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے اور اس پر کئی زاویوں سے گفتگو کی ہے۔ ابتدا میں جن لوگوں نے اسے صرف بے ہودہ افسانہ سمجھا، وہ رفتہ رفتہ خاموش ہو گئے اور کہانی کی گہرائی کے معترف نظر آئے۔

ادبی مبصّرین اس بات پر متفق ہیں کہ ''کھول دو'' اپنے عہد کا نہایت جرأت مندانہ بیانیہ ہے جس نے تقسیم کے المیے کو انسانی اقدار کے انہدام کی علامت بتا کر پیش کیا۔ ممتاز محقق ٹارَن سینٹ کا کہنا ہے کہ منٹو نے اس کہانی کے ذریعے تقسیم ہند کے سرمئی زون کو گرفت میں لیا ہے جہاں ایک ہی گروہ بیک وقت مظلوم بھی تھا اور ظالم بھی۔

وہ لکھتے ہیں کہ ''کھول دو'' میں تمام اخلاقی ڈھانچے زمین بوس ہو جاتے ہیں اور یوں یہ کہانی بین المذاہب منافرت کی اس سادہ تقسیم کا مقابلہ کرتی ہے جس میں ایک فریق مکمل طور پر اچھا اور دوسرا مکمل برا تصوّر کیا جاتا

ہے۔ منٹو نے اس افسانے میں قوم پرستی کی بنیادی پر کی جانے والی سماجی خدمات پر بھی سوال اٹھایا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ جب ریاستی نظم ختم ہو جائے تو نام نہاد سماجی کارکن بھی بھیڑیوں میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح نسائی نقطۂ نظر رکھنے والی ناقدین نے "کھول دو" کو عورت کے خلاف تشدّد کی مؤثر ترجمانی قرار دیا ہے۔ ایک تجزیہ نگار نے اسے ۲۰۱۲ء کے دہلی اجتماعی زیادتی سانحے کے تناظر میں دیکھتے ہوئے لکھا کہ منٹو کا افسانہ "کھول دو" انسانی گراوٹ کی انہی اتھاہ گہرائیوں کو ظاہر کرتا ہے جو اس واقعے میں دنیا نے دیکھیں۔ گویا منٹو کی تحریر آج بھی اتنی ہی زندہ، مؤثر اور متعلقہ ہے جتنی پچھتر سال پہلے تھی۔

وہ حلقے بھی آخر کار خاموش ہو گئے جن کا کہنا تھا کہ منٹو نے "کھول دو" میں فحاشی کی تمام حدیں پار کر دیں۔ حقیقت میں اس افسانے نے ثابت کر دیا کہ اگر کہانی سچائی پر مبنی ہو تو الزامات کوئی معنی نہیں رکھتے۔ چشمِ فلک نے دیکھا کہ جو کہانی ۱۹۴۸ء میں ریاست بمقابلہ منٹو زیر بحث تھی، آج وہی کہانی اردو ادب کا سرمایہ سمجھی جاتی ہے۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے بالکل درست لکھا تھا کہ "کھول دو" پڑھ کر کسی کے دل پر چوٹ نہ پڑے اور آنکھیں غم سے نم ہونے کے بجائے اس کے سفّلی جذبات بھڑک اٹھیں تو قصور کہانی کا نہیں بلکہ پڑھنے والے کے ذہن کا ہے۔

منٹو نے اپنے اوپر لگنے والے الزامات کا جواب اپنی تحریروں سے ہی دے دیا۔ جب معاشرہ خود برہنہ ہو تو سچ دکھانے والے کو فحش نگار کہنا دراصل آنکھیں بند کرنے کے مترادف ہے۔ چناں چہ آج "کھول دو" کو اس کے اصل تناظر میں سمجھا جاتا ہے۔ اسے نہ تو جنسی کہانی کہا جا سکتا ہے نہ محض فسادات کی داستان۔ بلکہ یہ انسانیت سے گرے ہوئے معاشرے کا وہ نوحہ ہے جو پڑھنے والے کو جھنجھوڑ کر احساس دلاتا ہے کہ نفرت اور تشدد کا انجام کتنا بھیانک ہوتا ہے۔

❋ ❋ ❋

مہک شبیر

فیض احمد فیض

فیض احمد فیض کی شاعری اردو ادب کا ایک انمول سرمایہ ہے اور ان کی دو غزلیں۔

ع "نہ گنواؤ ناوک نیم کش، دل ریزہ ریزہ گنوا دیا"

اور

ع "کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں، کب ہات میں تیرا ہات نہیں"

ان کے فن کے شاہکار ہیں۔ یہ غزلیں محبت، قربانی اور جدائی کے درد کو اس خوبصورتی سے بیان کرتی ہیں کہ وہ رومانیت اور انقلاب کے رنگوں کو ایک ساتھ سمو دیتی ہیں۔ اس سے پہلے کہ ان غزلوں کی تفصیل میں جایا جائے، فیض احمد فیض کی زندگی کا مختصر جائزہ لیتے ہیں۔

فیض احمد فیض ۱۳ فروری ۱۹۱۱ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کا گھرانہ علمی اور مذہبی روایات سے وابستہ تھا۔ ان کے والد سلطان محمد خان ایک معروف وکیل اور ادیب تھے اور انھوں نے فیض احمد فیض کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔ فیض نے ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں حاصل کی۔ انھوں نے عربی، فارسی اور اردو میں مہارت حاصل کی۔ بعد میں انھوں نے لاہور کے گورنمنٹ کالج سے انگریزی ادب میں بی۔ اے اور پھر ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ فیض نے اپنے کیریئر کا آغاز بطور مدرّس کیا اور امرتسر کے ایک کالج میں انگریزی پڑھائی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران وہ برطانوی فوج میں شامل ہوئے اور ترقی کرتے ہوئے لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے تک پہنچے۔ جنگ کے بعد انھوں نے فوج چھوڑ دی اور صحافت کے شعبے میں قدم رکھا۔ وہ "پاکستان ٹائمز" اور "امروز"

جیسے اخبارات کے مدیر رہے۔ فیض ترقی پسند تحریک کے اہم رکن بھی تھے اور انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے سماجی تبدیلی کی حمایت کی۔

فیض کی شاعری رومانوی اور انقلابی خیالات کا حسین امتزاج ہے۔ انھوں نے روایتی غزل کو نئے موضوعات سے مزّین کیا جیسے عشق، حسن، سماجی انصاف، مزدوروں کے حقوق اور آزادی کی جدوجہد، ان کی شاعری میں رومانیت کے ساتھ سیاسی بیداری بھی نمایاں ہے۔ وہ اپنے دور کے حالات جیسے استعمار، جبر اور آمریت کے خلاف لکھتے تھے۔ ان کے مشہور مجموعوں میں نقش فریادی، دست صبا، زنداں نامہ اور دست تہ سنگ شامل ہیں۔ ان کی شاعری سادہ لیکن گہری معنویت کی حامل ہے۔

فیض کی زندگی آسان نہیں تھی۔ انھوں نے کئی بار ظلم و جبر کا سامنا کیا۔ ۱۹۵۱ء میں انھیں راولپنڈی سازش کیس میں ملوّث ہونے کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ یہ کیس ایک بغاوت سے متعلق تھا جس میں فیض کا براہ راست کوئی کردار نہیں تھا، لیکن ان کے ترقی پسندانہ خیالات کی وجہ سے انھیں چار سال تک (۱۹۵۱ء-۱۹۵۵ء) جیل میں رکھا گیا۔ جیل میں انھوں نے اپنی شاندار شاعری تخلیق کی، جیسے زنداں نامہ میں شامل نظمیں۔ جیل سے رہائی کے بعد بھی ان پر کڑی نظر رکھی گئی۔

۱۹۵۸ء میں ایوب خان کے مارشل لاء کے بعد حالات مزید خراب ہوئے۔ فیض کو اپنے خیالات کی وجہ سے پاکستان میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۹۶۴ء میں وہ خود ساختہ جلاوطنی اختیار کر کے بیروت (لبنان) چلے گئے۔ وہاں انھوں نے لوٹس نامی جریدے کی ادارت کی اور فلسطینی جدوجہدِ آزادی کی حمایت میں لکھا۔ وہ کئی سال تک پاکستان سے باہر رہے لیکن اپنی شاعری کے ذریعے وہ اپنے وطن سے جڑے رہے۔ ۱۹۷۷ء میں ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں وہ واپس پاکستان آئے اور اپنی زندگی کے آخری ایام تک ادب اور شاعری سے وابستہ رہے۔

فیض احمد فیض ۲۰ نومبر ۱۹۸۴ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔ فیض کی زندگی ایک شاعر، مصلح اور باغی کی

زندگی تھی۔ انھوں نے اپنے قلم سے نہ صرف محبت کے گیت لکھے بلکہ ظلم کے خلاف آواز بھی اٹھائی۔

فیض احمد فیض کی زندگی اور شاعری پر کئی اہم تنقیدی اور تحقیقی مضامین اور کتابیں اردو میں لکھی گئی ہیں ان میں سے چند قابل ذکر کاموں پر روشنی ڈالتے ہیں:

فیض احمد فیض: حیات، شخصیت اور کارنامے از ڈاکٹر عبدالرؤف ملک

یہ کتاب فیض کی زندگی پر ایک جامع تحقیقی کام ہے۔ عبدالرؤف ملک نے فیض کی ولادت سے لے کر وفات تک کے مراحل کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس میں ان کی تعلیم، فوجی زندگی، صحافت، جیل کے ایام اور جلا وطنی کے تجربات کو تاریخی تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ مصنّف نے خاص طور پر راولپنڈی سازش کیس کے دوران فیض کی قید کو ایک اہم موڑ قرار دیا اور اس دوران تخلیق ہونے والی شاعری جیسے "دست صبا" اور "زنداں نامہ" کو ان کی زندگی کے عکاس کے طور پر دیکھا۔

فیض احمد فیض: ایک مطالعہ از احمد ندیم قاسمی

احمد ندیم قاسمی جو خود ایک بڑے ادیب اور فیض کے ہم عصر تھے انھوں نے اس مضمون میں فیض کی زندگی کو ان کے ادبی سفر کے تناظر میں دیکھا۔ انھوں نے فیض کے ابتدائی رومانوی دور (جیسے "نقش فریادی") سے لے کر انقلابی شاعری (جیسے "سرِ وادیِ سینا") تک کے کام پر روشنی ڈالی۔

فیض احمد فیض کی شاعری: ایک تنقیدی جائزہ از ڈاکٹر وزیر آغا

ڈاکٹر وزیر آغا نے فیض کی زندگی کے نشیب و فراز کو ان کی شاعری کے تناظر میں دیکھتے ہوئے ایک مضمون لکھا۔ انھوں نے فیض کی جلاوطنی اور جیل کے تجربات کو ان کی شاعری میں عالمگیر موضوعات جیسے ظلم کے خلاف آواز اور امن کی خواہش کے ابھرنے کا سبب قرار دیا۔ وزیر آغا نے فیض کے اسلوب کو روایتی غزل اور جدید نظم کا حسین امتزاج کہا اور ان کی زندگی کے سیاسی پس منظر کو ان کے فن کا بنیادی جزو مانا۔

فیض احمد فیض کی غزل ''نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش دل ریزہ ریزہ گنوا دیا'' ان کا ایک شاہکار ہے جو ان کے مجموعہ ''نسخہ ہائے وفا'' میں شامل ہے۔ یہ غزل فیض کے ابتدائی دور کی تخلیق سمجھی جاتی ہے، جو ان کے مجموعہ نقش فریادی یا اس کے بعد کے حالات سے متاثر ہو سکتی ہے۔ اگرچہ اس کی تخلیق کا درست وقت واضح نہیں، لیکن فیض کے ناقدین اسے ان کے رومانوی دور سے جوڑتے ہیں جو بعد میں ان کے انقلابی خیالات سے اُبھرا۔ فیض کی زندگی میں محبت، جدائی اور سماجی جدوجہد کے تجربات اس غزل کے پس منظر کا حصہ ہو سکتے ہیں۔ خاص طور پر ان کی شادی کے بعد کے ابتدائی ایام یا ان کے ترقی پسند نظریات کے ابھرنے سے پہلے کے جذبات اس میں جھلکتے ہیں۔ یہ غزل ان کے ذاتی اور جذباتی تجربات کی عکاسی کرتی ہے، جو انھوں نے اپنی بیوی ایلس فیض سے محبّت اور جدائی کے لمحات میں محسوس کیے۔

اس غزل کا تناظر رومانوی اور علامتی ہے۔ فیض نے اس میں محبت کو ایک ایسی طاقت کے طور پر پیش کیا جو عاشق کو تباہ بھی کرتی ہے اور اسے غرور بھی دیتی ہے۔ یہ غزل محض ذاتی محبت کی کہانی نہیں، بلکہ اسے وسیع تر معنوں میں زندگی کی جدوجہد اور قربانی سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ فیض کا دور برطانوی راج اور تقسیم ہند کا دور تھا، جہاں ذاتی اور سماجی دونوں سطحوں پر کشمکش عروج پر تھی۔ اس تناظر میں، یہ غزل اندرونی اور بیرونی دونوں جہانوں کی لڑائی کو بیان کرتی ہے۔ محبوب سے جدائی کا درد اور دشمنوں کے سامنے عزّت نفس کو برقرار رکھنے کی جدوجہد ہے۔

فیض نے روایتی غزل کی شکل کو برقرار رکھتے ہوئے اسے جدید موضوعات سے مزّین کیا ہے۔ اس میں قافیہ ''دیا'' اور ردیف کا استعمال روایتی ہے، لیکن معانی کی گہرائی جدید ہے۔ ان کی زبان سادہ لیکن معنی خیز ہے، قاری کو بھی سمجھ آتی ہے اور ناقد کو بھی سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔

اس غزل کا سب سے مشہور شعر درج ذیل ہے:

جو رُکے تو کوہ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

اس غزل کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ محبت کو ایک ایسی طاقت دیتی ہے جو عاشق کو تباہ کرتی ہے لیکن اسے سربلند بھی رکھتی ہے۔ "کہ غرور عشق کا بانکپن پس مرگ ہم نے بھُلا دیا" اس کی واضح مثال ہے۔ یہ غزل محبت کے ساتھ ساتھ زندگی کے لیے لڑنے اور قربانی دینے کے جذبے کو بھی اجاگر کرتی ہے، جو فیض کے ترقی پسند نظریات سے ملتا ہے۔ اس کے اشعار ذاتی تجربے سے شروع ہو کر عالمگیر سچائی تک پہنچتے ہیں جو اسے ہر دور کے قاری کے لیے متعلقہ بناتے ہیں۔

"جو رُکے تو کوہ گراں تھے ہم....." کو اس غزل کا خاص شعر سمجھا جاتا ہے جو کہ غزل کے لیے روح کا کام کرتا ہے۔ ناقدین کے مطابق یہ فیض کی اپنی زندگی کا عکاس ہے۔ جب وہ رکتے تو ان کا وجود ایک مضبوط پہاڑ کی طرح ہوتا ہے اور جب چلتے ہیں تو جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔ "رہ یار" کو محبت کے سفر کے ساتھ ساتھ ان کی سماجی اور سیاسی جدوجہد سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسے سن کر یا پڑھ کر فیض کے عاشقانہ اور انقلابی مزاج کا اندازہ ہوتا ہے۔

فیض کا ابتدائی دور برطانوی راج اور تقسیم ہند کے قریب تھا۔ اس غزل کو اس تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے کہ یہ محبت کی کہانی کے ساتھ ساتھ قومی اور سماجی تبدیلیوں کے دوران کی بھی عکاسی کرتی ہے۔ "دل ریزہ ریزہ گنوا دیا" کو ذاتی نقصان کے ساتھ ساتھ وطن کی تقسیم کے زخموں سے بھی جوڑا جا سکتا ہے۔ فیض "ترقی پسند تحریک" کے اہم رکن تھے۔ اس غزل میں "جو وہ قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا" جیسا شعر ان کے اس نظریے کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ زندگی کو ظلم کے خلاف لڑنے کے لیے قربان کیا جا سکتا ہے۔

اگرچہ یہ غزل "زنداں نامہ" سے نہیں، لیکن اس کے کچھ اشعار مثلاً "مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو"

فیض کے جیل کے ایام کے مزاحمت کے جذبے سے مل سکتے ہیں۔ استعارے اور تشبیہات کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔ ''ناوک نیم کش'' (آدھا کھینچا تیر) اور ''کوہ گراں'' (بھاری پہاڑ) جیسے استعاروں سے غزل کو علامتی گہرائی دی گئی ہے۔ غزل کی روانی اور لفظوں کا آہنگ اسے گانے کے قابل بناتے ہیں۔

فیض احمد فیض کی اس غزل پر ناقدین نے کئی تبصرے کیے ہیں جیسے کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے کہا کہ یہ غزل فیض کے رومانوی دور کا عروج ہے، جہاں محبت کو جنگ اور فتح کے طور پر پیش کیا گیا۔ ''جو رُکے تو کوہ گراں تھے ہم'' ان کے اندرونی عزم کی عکاسی کرتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے مطابق یہ غزل فیض کی زندگی کے مشکل حالات اور لمحات کی داستان ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے درد کو فن کے سانچے میں ڈھالا اور اسے ابدی بنایا۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اسے ''فلسفیانہ گہرائی'' سے تعبیر کیا اور کہا کہ یہ ''محبت کی کہانی اور عظمت دونوں کو بیان کرتی ہے۔''

اس غزل کو فریدہ خانم، اقبال بانو اور مہدی حسن جیسے عظیم گلوکاروں نے گایا، جس نے اس کی مقبولیت کو چار چاند لگا دیے۔ خاص طور پر مہدی حسن کی آواز میں یہ غزل سننے والوں کو دنیا سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ یہ غزل ادبی حلقوں میں بھی بہت پسند کی گئی اور اسے فیض کے بہترین کاموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی سادہ زبان اور گہرے معانی نے اسے عام لوگوں تک پہنچایا اور آج بھی یہ محفلوں میں پڑھی اور گائی جاتی ہے۔

فیض احمد فیض کی غزل ''کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں، کب ہات میں تیرا ہات نہیں'' ان کی شاعری کا ایک اور نمونہ ہے جو ان کے مجموعہ دست تہ سنگ میں شامل ہے۔ یہ غزل اپنی گہرائی، جذباتی شدّت اور محبت کے فلسفے کی وجہ سے مشہور ہے۔

یہ غزل فیض نے اپنے جیل کے ایام (۱۹۵۱ء-۱۹۵۵ء) کے دوران یا اس کے فوراً بعد لکھی تھی جب وہ راولپنڈی سازش کیس میں بند تھے۔ اس دو میں فیض کو اپنی بیوی ایلس فیض سے جدائی کا سامنا تھا اور ان کی شاعری

سے محبت، جدائی اور وفاداری کے جذبات گہرے طور پر ابھر کر سامنے آئے۔ دست تہ سنگ (۱۹۵۶ء) ان کی جیل سے رہائی کے بعد شائع ہوا اور اس مجموعے میں شامل کئی نظمیں اور غزلیں ان کے ذاتی تجربات اور جذباتی کشمکش کی عکاسی کرتے ہیں۔

اس غزل کا پس منظر فیض کی اپنی محبت اور ان کے سیاسی عزائم سے جُڑا ہوا ہے۔ وہ اپنی بیوی سے گہری محبت کرتے تھے اور جیل میں رہتے ہوئے انھوں نے ایلس کے نام کئی خطوط لکھے جو بعد میں زنداں نامہ کے نام سے شائع ہوئے۔ یہ غزل انہی جذبات کی شاعرانہ ترجمانی کرتی ہے۔ جہاں وہ جدائی کے باوجود محبت کی موجودگی اور اس کی طاقت کو محسوس کرتے ہیں۔ ناقدین کا خیال ہے کہ یہ غزل صرف ان کی ذاتی محبت کے لیے نہیں بلکہ ان کے وطن، عوام اور اپنے نظریات سے وفاداری کے لیے بھی لکھی گئی۔ ''کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں'' جیسا شعر اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ محبوب جو بیک وقت ان کی بیوی، وطن یا نظریہ سے محبت کا ترجمان ہو سکتا ہے، ہمیشہ ان کے ساتھ موجود ہے، چاہے وہ جسمانی طور پر جدا ہی کیوں نہ ہوں۔ جیل کی تنہائی نے فیض کو اندرونی طاقت اور محبت کی ابدیت پر غور کرنے کا موقع دیا اور یہ غزل اسی سوچ کا نتیجہ ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اس غزل کے کچھ اشعار فیض نے جیل میں رہتے ہوئے لکھے، جہاں انھوں نے اپنی بیوی کے خطوط سے حوصلہ پایا۔ اس غزل کو مہدی حسن اور نصرت فتح علی خاں نے گایا اور مہدی حسن کی آواز میں یہ غزل فیض کی سب سے زیادہ مشہور غزلوں میں سے ایک بن گئی۔ آخری شعر ''یہ بازی عشق کی بازی ہے'' کو زندگی اور جدوجہد کے فلسفّے کے طور پر دیکھا جاتا ہے جو اسے عالمگیر بناتا ہے۔

یہ غزل محبت کی رومانیت کے ساتھ فلسفیانہ سوچ کو جوڑتی ہے۔ ''یہ جان تو آنی جانی ہے'' جیسا شعر زندگی کے فانی ہونے کا پتہ دیتا ہے۔ فیض کی زبان سادہ لیکن گہری ہے قافیہ ''نہیں'' اور ردیف کا استعمال اسے موسیقیت دیتا ہے۔ ''کوچہ جاناں' محبت کے سفر کی علامت ہے جب کہ ''مقتل'' جیل یا جدوجہد کے میدان کی طرف اشارہ

کرتا ہے۔

''جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا'' میں فیض کا مزاحمتی لہجہ جھلکتا ہے جو ان کے ترقی پسند خیالات سے ملتا ہے۔ اس غزل کا سب سے مشہور شعر درج ذیل ہے:

یہ بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

یہ شعر اس غزل کی جان ہے۔ جہاں ہار اور جیت دونوں ہی معنی خیز ہیں اگر جذبہ برقرار ہو۔ ناقدین اسے فیض کے انقلابی اور رومانی مزاج کا عروج مانتے ہیں۔ یہ ان کے جیل کے تجربات سے بھی جُڑتا ہے جہاں انھوں نے اپنی جان کو داؤ پر لگایا لیکن ہمّت نہیں ہاری۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے فیض احمد فیض کی مجموعی شاعری پر تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔

اردو ادب کی تنقیدی تاریخ میں محمد حسن عسکری نے فیض احمد فیض کی شاعری کو معنوی لحاظ سے خوبصورت اور زبان و بیان میں شائستہ قرار دیا لیکن ان پر نظریاتی، خاص طور پر مارکسی اور ترقی پسند فکر کے غلبے کی وجہ سے تنقید بھی کی ہے۔ عسکری کے مطابق فیض کی شاعری میں سیاسی نظریات کبھی کبھار فن کی روحانیت اور فکری گہرائی کو محدود کرتے ہیں۔ وہ فیض کی رومانوی حِس اور کلاسیکی اسلوب کو سراہتے ہیں، لیکن ان کی انقلابی شاعری کو سادہ لوحی اور خواب ناک کیفیت کا حامل بھی سمجھتے ہیں۔ عسکری کے روحانی رجحانات کے تناظر میں انھوں نے فیض کی مادہ پرستانہ فکر کو انسانی وجود کے بنیادی سوالات کے لیے ناکافی قرار دیا۔

اس غزل میں یاد اور قربت کا تصوّر، جدائی کا حُسن اور محبت کا پہلو نظر آتا ہے۔ غزل میں ''یاد'' کو صرف ماضی کا حوالہ نہیں بلکہ ایک زندہ موجود تجربے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

فیض جدائی کو المیہ کے بجائے ایک ''جمالیاتی تجربہ'' بناتے ہیں۔ یہاں جدائی دُکھ کی علامت نہیں بلکہ

عشق کی شدّت کا ثبوت ہے۔ غزل میں عاشق کسی شکوے یا گلے کی بجائے ایک نرم اور پُر خلوص محبت کے جذبے کے ساتھ مخاطب ہے۔ محبت نہ تو الزام دیتی ہے اور نہ ہی خود کو مظلوم بناتی ہے۔ یہ ایک بالغ اور باوقار محبت ہے۔ فیض کی یہ غزل عشق کی اس کیفیت کو ظاہر کرتی ہے جہاں محبوب کی یاد بھی ایک تسکین بن جاتی ہے۔ شاعر کی شخصیت یہاں صبر، برداشت اور قربانی کے جذبات سے معمور ہے۔ وہ محبوب کو الزام نہیں دیتا بلکہ اپنے دُکھ کو جمالیاتی تجربہ میں ڈھال دیتا ہے۔

فیض کی غزل میں تصویری اظہار اہمیت رکھتا ہے اور اس غزل میں بھی انھوں نے یاد کی جو تصویر پیش کی ہے وہ نہ صرف بصری ہے بلکہ ایک احساس بھی ہے۔ غزل کے اشعار میں محبوب کی یاد کو ایک زندہ اور مستقل وجود کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو شاعر کے دل میں ایک مستقل حالت کے طور پر برقرار رہتی ہے۔

فیض کی زبان میں سادگی اور گہرائی کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ انھوں نے کسی بھی پیچیدہ یا دشوار گویائی سے گریز کرتے ہوئے، محبت کے پیچیدہ جذبات کو انتہائی سادہ اور دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ یہی سادگی ان کی شاعری کو عالمی سطح پر مقبول کرتی ہے۔

ان غزلوں کے علاوہ بھی فیض صاحب نے بہت سی اور غزلیں لکھی ہیں جو کہ لوگوں میں بہت مقبول ہیں۔ ان میں سے ایک غزل کا قصّہ کچھ یوں ہے کہ فیض صاحب سیالکوٹ کے جس مکان میں رہائش پذیر تھے اس مکان کے سامنے ایک لڑکی رہا کرتی تھی۔ فیض صاحب اس کی اُلفت میں مبتلا تھے۔ ایک روز جب وہ کالج گئے اور واپس آئے تو دیکھا کہ وہ لڑکی وہاں نہیں ہے۔ آغا ناصر صاحب اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ فیض صاحب جب بہت مشہور ہو گئے اور واپس سیالکوٹ آئے تو اسی وقت اتفاقاً وہ لڑکی بھی وہاں اپنے شوہر کے ساتھ آئی ہوئی تھی اور جب ان کی ملاقات ہوئی تو اس لڑکی نے فیض صاحب سے کہا کہ دیکھیے میرا شوہر کتنا خوبصورت ہے تو فیض صاحب فرماتے ہیں کہ:

تم نے دیکھی ہے وہ پیشانی، وہ رخسار، وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصوّر میں لٹا دی ہم نے
تجھ پہ اٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے کیوں عُمر گنوا دی ہم نے
ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا سیکھا ہے
جُز، تیرے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں

اس غزل کے اگر دل چسپ حقائق کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس غزل کو جگجیت سنگھ اور چترا سنگھ نے گایا جس سے اس کی مقبولیت میں مزید اضافہ ہوا۔ ان کی آواز نے اس غزل کی شاعری کو موسیقی کے ذریعے زندہ کیا اور اسے دنیا بھر میں سننے والوں کے دلوں میں جگہ دی۔ فیض کی غزل ایسا رومانوی سنگ میل ہے جسے نہ صرف اردو شاعری بلکہ عالمی سطح پر بھی پذیرائی حاصل ہے۔ اس میں عشق اور یاد جیسے عمیق موضوعات کا بیان اس کی دلکشی کا سبب ہے۔

فیض کی ایک نظم "یہ فصل امیدوں کی ہمدم" کے بارے میں ڈاکٹر اسرار احمد کہتے ہیں کہ ان کو بہت پسند تھی۔ حیرانی کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ اس قسم کی کسی کشاکش میں کسی تحریک میں بالفعل تو شریک بھی نہیں رہے کیوں کہ شاعر تھے لیکن نظم بہت حسین لکھی۔

ایک دل چسپ حقیقت یہ ہے کہ مصر میں ۱۹۵۰ء کی دہائی میں فیض احمد فیض کی شاعری کو ایک مخصوص مقام حاصل تھا۔ فیض کو مصر کے سب سے بڑے ادبی ایوارڈ یعنی "جائزہ کرامے" سے نوازا گیا تھا جس کا تعلق مصر کے ادبی و ثقافتی حلقوں کے ساتھ ان کے تعلقات کو مضبوط کرنے سے تھا۔ ان کے اشعار نے مصر کے عظیم شاعروں کو بھی متاثر کیا۔

فیض احمد فیض کی شاعری نے اردو ادب کو عالمی سطح پر متعارف کروایا۔ ان کے اشعار نہ صرف اردو میں

مقبولیت کے حامل ہیں بلکہ انگریزی، عربی، فرانسیسی اور سپینش میں بھی ترجمہ ہوئے ہیں۔ ان کی شاعری کا ترجمہ مختلف ممالک میں کیا گیا اور اس کے اثرات نے انقلابی اور سماجی تحریکوں کو تحریک دی۔ کینیڈا اور برطانیہ میں ان کی شاعری کو وہاں کے ادبی حلقوں میں انقلابی اور سوشلسٹ تحریکوں کی حیثیت سے دیکھا گیا۔ کینیڈا میں فیض کی شاعری کو "لیبر موومنٹ" اور "سوشلسٹ تحریکوں" کے لیے ایک حوصلہ افزا نغمہ قرار دیا گیا تھا۔ فیض احمد فیض کا کینیڈا کے ادبی حلقوں میں بھی اثر پایا جاتا ہے اور وہاں کی پاکستانی کمیونٹی نے ان کی شاعری کو ایک نئی شناخت اور معنی دیا۔

ان کی شاعری میں کلاسیکی اردو شاعری کے تمام اصولوں کو نئے انداز میں پیش کیا گیا۔ انھوں نے غزل اور نظم میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ ان کی شاعری میں رومانویت اور سماجی حقیقت پسندی کا حسین امتزاج تھا۔ انھوں نے مزدوروں، کسانوں اور محنت کشوں کے حقوق کے لیے بھی آواز اٹھائی۔

فیض احمد فیض نے اپنے اشعار میں خالی ہونے کی حالت اور خوابوں کا ایک فلسفہ پیش کیا ہے۔ وہ ہمیشہ خوابوں کی اہمیت پر زور دیتے تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ انسان کے خواب ہی وہ محرک ہیں جو اُسے تبدیلی اور ترقی کی طرف لے جاتے ہیں۔ ان کی غزل "خواب" کو انقلاب کی علامت کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔

فیض احمد فیض کی شاعری میں نہ صرف حسین خیالات اور جذبات کا عکس ملتا ہے، بلکہ اس میں انسانیت، محبت اور سماجی انصاف کا ایک مضبوط پیغام بھی پوشیدہ ہے۔ ان کی غزلوں اور نظموں میں گہرائی، فکر اور جذبے کا امتزاج ہے جو نہ صرف اردو ادب کو ایک نیا زاویہ فراہم کرتا ہے بلکہ عالمی سطح پر بھی لوگوں کو اُمید اور انقلاب کی ترغیب دیتا ہے۔

❋ ❋ ❋

نمود، شمارہ ۱۴، ۲۰۲۵ء

شاہ نواز خان شہیدیؔ

افسانہ ''محاصرہ'' کا فنی و فکری تجزیہ

آصف فرخی کا افسانہ ''محاصرہ'' علامتی اور تجریدی انداز میں انسانی نفسیات اور حالاتِ زندگی کی پیچیدگیوں کو پیش کرتا ہے۔ اس افسانے کا موضوع سماجی مسائل، افراتفری، سیاسی مسائل، پردیس اور انسانی بے بسی ہے۔ جو عام زندگی کے تجربات کو علامتی شکل میں بیان کرتا ہے۔

آصف فرخی ریختہ سے ایک انٹرویو کے دوران کہتے ہیں کہ ہمیں ہم عصریت کے بارے زیادہ فکر کرنے کی ضرورت ہی کیوں پڑتی ہے، درست طریقہ تو یہ ہے کہ ہمیں افسانے سے ہم عصریت کی طرف آنا چاہیئے، یعنی ہمیں اُس افسانے کو اپنے دور کے مسائل کے مطابق دیکھنا چاہیئے۔ اسی طرح اُن کی یہ بات اور اُن کا ہی لکھا ہوا فن پارہ ''محاصرہ'' آج کل کے ہمارے قومی حالات کی ترجمانی کرتا ہے۔ حالاں کہ انھوں نے یہ افسانہ ۱۹۹۵ء میں لکھا تھا جو کہ اُن کی کتاب ''شہر ماجرا'' میں شامل ہے۔ لیکن اتنے سال بیتنے کے بعد بھی کیا ہمارے حال میں کوئی تبدیلی یا درست سمت نظر آرہی ہے؟ کیا اگر نوّے کی دہائی کے سیاسی صورتحال کو آج کی صورتحال سے تولیں تو کوئی فرق دکھائی دے گا؟ انسانی بے بسی کا کیا حال ہے، لوگوں نے تو اب سیاست دانوں پہ اعتبار ہی کرنا چھوڑ دیا ہے، وہ اُن اداروں سے بھی بیزار ہو چکے ہیں جن کو شاید کسی زمانے میں وہ اپنا فخر سمجھتے تھے۔ حالاں کہ سیاست دان تب بھی وہی تھے اور آج بھی وہی ہیں۔ ہاں وہی سیاست دان جن کو اقتدار کی لت پڑی ہوئی ہے۔ وہی سیاست دان جو جمہوریت کے نام پر خاندانی سیاست کرتے آرہے ہیں۔ سیاست جیسے ایک اہم موضوع کو اُنھوں نے شرمندہ کر رکھا ہے، اُنھوں نے اپنے مفاد کی خاطر سادہ لوح عوام کو ہمیشہ محض استعمال ہی کیا ہے۔ آپ خود دیکھیئے، کیا اِن

لوگوں نے عوام کو محض جلسہ گاہوں اور پنڈالوں کو سجانے کی شے نہیں سمجھا ہے؟ میرے مطابق تو عوام اِن کے لیے محض ایک کھلونا ہیں۔ نوّے کی دہائی میں کراچی میں جو صورتحال ظہور پذیر تھی اُس میں استعمال ہونے والے لوگ بھی سادہ عوام، مرنے والے بھی سادہ عوام، بے بس بھی سادہ عوام اور اپنے پیاروں کی خاطر اپنی جان ہتھیلی پر رکھنے والے بھی سادہ عوام ہی تھے۔ جن سیاسی جماعتوں میں چپقلش تھی اُن کا کیا گیا اس میں؟ جو طلباء و طالبات کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے جاتے تھے اور بلاوجہ سنگین سیاسی صورتحال کا شکار ہوتے چلے جا رہے تھے۔ کبھی اُن کے تعلیمی ادارے غیر معینہ مدت کے لیے بند تو کبھی اچانک کرفیو کا لگنا۔ ہر طرف قتل و غارت گری اور دنگے فساد، انسان جائے تو جائے کہاں؟ اگر ''محاصرہ'' کو آج کل کے زمانے کے مطابق بھی تو حالات اُس سے بھی بدتر ہیں اور بدتر سے بدترین بنتے جا رہے ہیں۔

''محاصرہ'' ایک ایسا افسانہ ہے جہاں ایک محصور شہر کی منظر کشی کی گئی ہے، جہاں کے باسی مشکلات، خوف اور نااُمیدی کا شکار ہیں۔ یہ شہر دراصل اُن معاشرتی اور سیاسی حالات کی علامت ہے جو کسی بھی قوم یا معاشرے کو غیر یقینی کیفیت میں مبتلا کر سکتے ہیں۔ ادبی رو سے جس شہر کا ذکر اس افسانے میں شامل ہے وہ تو ایک علامتی حیثیت رکھتا ہے مگر صاف ظاہر ہے کہ کس شہر کی بات ہو رہی ہے۔ افسانے میں موجود شہر ایک علامت ہے، جو انسانی زندگی، سماجی دباؤ اور نفسیاتی کشمکش کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ ان حالات کی نمائندگی کرتا ہے، جہاں معاشرہ اپنی روایات اور اقدار کھو بیٹھتا ہے۔ اور اس پر داخلی اور خارجی مسائل کا دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ اس افسانے میں منظر کشی اس قدر خوبصورتی کے ساتھ کی گئی ہے کہ انسان پڑھتے ہوئے یہ محسوس کرتا ہے کہ گویا کہ وہ خود ان گلیوں میں شدید خوف کے ساتھ چل رہا ہو۔

افسانہ ''محاصرہ'' انسانی بے بسی، خوف، تنہائی اور جدوجہد کو ایک محصور شہر کے باسیوں کے ذریعے بیان کرتا ہے۔ کرداروں کے مکالمات اور اُن کے جذبات اس امر کی عکاسی کرتے ہیں کہ حالات چاہے کتنے ہی

ناساز گار کیوں نہ ہوں، انسان زندہ رہنے کی تگ و دو میں لگا رہتا ہے۔ مثلاً افسانے میں مصنّف خود اپنی ماں کے گھر جانے سے گُریز کرتا ہے کہ کہیں شدید حالات کی وجہ سے سفر کے دوران جان چلی نہ جائے۔ ماں سینکڑوں دفعہ اسے کال پہ کال کرتی ہے لیکن مصنف اس خوف کا شکار رہتا ہے اور وہ یہاں تک اپنی ماں سے کہتا ہے کہ ''آپ کے ہاں تو اب بوری میں بند ہو کر آنا ہی ممکن ہے...'' کسی نے کیا خوب کہا ہے ''ماں تو ماں ہوتی ہے''۔ بظاہر تو یہ ایک چھوٹا سا جملہ ہے لیکن اس میں پورا فلسفہ چھپا ہوا ہے اور یہ کوئی عام انسان سمجھ بھی نہیں سکتا۔ محاصرہ میں ایک ماں ہے جو اس سنگین صورتحال کے دوران اپنے بچوں سے ملنے سے قاصر رہتی ہے۔ اُن کے بچے اپنی ماں سے الگ اسی شہر میں پردیسی ہوتے ہیں، یعنی مصنّف خود بھی یہ بات کہتے ہیں کہ زندگی کے تین سے چار عشرے انھوں نے اپنی ماں کے ساتھ آبائی محلے میں گزارے اور اپنا پرانا محلہ تو اپنا ہوتا ہے، اپنا پرانا گھر تو اب بھی وہی لگتا ہے..... میں خود پینتیس، چھتیس برس وہاں رہا ہوں۔ شاید ہی کسی اور رشتے کو اتنی زیادہ تکلیف اپنے بچوں سے نہ ملنے کی ہو، اُن کی ماں بہت تکلیف میں تھی۔ اس صورتحال سے پہلے بچوں سے ہفتہ وار ملتی تھی۔ اُن کے لیے بیٹے نہیں وہ ابھی بھی بچے تھے۔ کبھی مصنف کو فون آتا کہ میں تو سارا دن آپ کا انتظار کر رہی تھی تو کبھی اُن کے لیے پلاؤ گرم کر کے رکھنا کہ جب وہ گھر آئے تو کھالے۔ ماں کو شہر کی صورتحال کا خوب اندازہ تھا، لیکن پھر بھی وہ اپنے بیٹوں سے ملے بغیر بہت بے بس اور تنہائی کا شکار تھی۔ اور یہاں اُن کے بیٹے اسی شہر میں رہتے ہوئے پردیسی بن گئے تھے۔ بیٹوں نے ملنے کی ہر طرح کی جدوجہد کی لیکن مشکلات ہی مشکلات سامنے موجود تھیں۔

''محاصرہ'' محض ایک شہر کی بات بھی نہیں ہے بلکہ یہ عالمی سطح پر پھیلی ہوئی سیاسی افراتفری، اور جنگوں کا بھی استعارہ ہے۔ یہ افسانہ اُن خطوں کی بھی نمائندگی کرتا ہے جو مسلسل خطرات کا شکار ہیں، اور جہاں کے لوگ بیرونی طاقتوں کے ظلم اور داخلی کمزوریوں کے سبب محصور ہو کر رہ جاتے ہیں۔ محصور کا مطلب صرف شہروں کی بندش ہی نہیں، اگر ہم حقیقی معنوں میں سوچیں تو کالونیل طاقتوں نے بہت سے خطوں میں لوگوں کے جسمانی

کنٹرول کے ساتھ ساتھ اُن کے ذہنوں پر بھی کنٹرول حاصل کیا تھا۔ وہ چاہتے ہی یہی تھے کہ سادہ لوح عوام کو ذہن سازی کے ذریعے کنٹرول میں لائیں، اور بد قسمتی سے ہم بھی اس ظلم کا شکار رہے ہیں۔ آج کل کے زمانے میں ہم نیو کالونیل ازم (Neo-Colonialism) میں رہ رہے ہیں، یہ دور بھی پچھلے دور کی طرح ہی ہے لیکن فرق اتنا ہے کہ بظاہر عام عوام کو کنٹرول کرنے کے لیے ہماری قوم میں سے ہی چند اشرافیہ کو چنا جاتا ہے اور وہ کسی بیانیے کے ذریعے عوام کی ذہن سازی کر لیتے ہیں۔ لیکن اِن کو کنٹرول کرنے والے لوگ وہی ہیں جو پہلے خود آ کے قبضہ و ذہن سازی کرتے تھے۔ متن یہ ہے کہ جنگ، احتجاج، یا سنگین دنگے اور فساد جہاں بھی ہوں، اس میں متاثر ہونے والے لوگ عوام میں سے ہی ہوتے ہیں۔ اس میں زندگی، عزت اور وقار ایک عام آدمی کا ہی جاتا ہے نہ کہ اُن کا جن کے نام پر تحریکیں چلتی ہیں۔ یہ انسانی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ ہے!

اس افسانے میں مرکزی کردار مصنّف کا اپنا ہے جس کے گرد سب کچھ گھومتا ہے۔ میرا فی الحال تو مقصد افسانے کے بنیادی فکری عناصر پر بات کرنا ہے لیکن اس افسانے میں کچھ ثانوی فکری عناصر بھی موجود ہیں جن کا ذکر کیے بغیر آصف فرخی کا کوئی افسانہ پڑھنا مجھے کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ مصنف خود ایک آزاد انسان ہے جس کو اپنے آبائی گھر اور خاص طور پر اپنی ماں کا بہت خیال ہے۔ اپنے آبائی محلے میں نہ رہنا اُس کی مجبوری ہے لیکن وہ کام کی خاطر روز اُس محلے سے جہاں زندگی کا بیشتر حصّہ گزارا ہے، نہیں جا سکتا ہے۔ جس کی وجہ سے جہاں روزگار ہے وہاں قیام کرتا ہے۔ اور جہاں مصنف اپنی فیملی کے ساتھ رہتا ہے وہ اُن کے آبائی محلّے سے کافی دور ہے، لیکن رہتے پھر بھی ایک شہر میں ہیں۔ مصنف کے بھائی بھی اُن ہی کی طرح معمولات زندگی کی کشمکش میں ماں سے الگ رہتے ہیں۔ سب سے خوبصورت بات یہ ہے کہ مصنّف اور ان کے بھائی اب بھی اپنے آبائی گھر کو اپنا گھر سمجھتے ہیں اور اُن دونوں کو اپنے گھر جہاں وہ روزگار کی خاطر رہ رہے ہیں سے زیادہ محبت اپنے آبائی محلے والے گھر سے ہے۔ مصنف کے پاس ایک کار بھی موجود ہے، اور وہ یقیناً کار کے ذریعے ہی اپنے کام پر جاتے ہیں۔ یعنی مصنف اور اُن

کی فیملی ویل۔ آف (Well-off) ہے۔ وہ ماہوار اپنی ماں کو رقم بھی دے آتے ہیں اور دونوں بھائیوں کو اس بات پہ کبھی مسئلہ بھی نہیں ہوا۔ مصنف اِس سیاسی صورتحال سے پہلے ہر ہفتے جمعے کے روز امی کے ہاں فیملی کے ساتھ جاتے تھے۔ امی کو بھی مصنف اور ان کی بیگم سے بے حد لگاؤ تھا، دنگوں کی وجہ سے اُن کا آبائی گھر نہ جانا امی کے لیے کسی دردِ سر سے کم نہ تھا۔ یہ عجیب بات کہیے یا کچھ اور، ہاں اس پہ بات بھی کی جاسکتی ہے کہ امی کو اپنے ساتھ مصنف کیوں نہیں رکھتے تھے؟ چلیئے روزگار کی خاطر وہ آبائی محلہ نہیں جاتا تھا لیکن امی تو کوئی کام بھی نہیں کر رہی تھی۔ وہ اس لیے کہ ایک مرتبہ امی کو انھوں نے اپنے ساتھ اپنے گھر بھی لائے تھے، لیکن وہ چین سے نہیں رہ سکیں کیوں کہ اُن کو اپنے محلے کی یاد ستانے لگی اور اس کی وجہ سے مصنّف کو دوبارہ انھیں آبائی محلہ پہنچانا پڑا۔ امی کو نہ پیسے چاہیئے تھے اور نہ اور کوئی آسائش، بس اگر اُس کو کچھ چاہیئے تھا تو وہ اپنا آبائی گھر اور اس کے بچے۔ جب وہ اپنے آبائی گھر میں ہوتی تھی تب وہ اپنے بیٹے کی یاد میں سارا سارا دن رہتی تھی۔ جب بیٹا، انھیں اپنے گھر لایا تو انھیں اپنے گھر کی یاد ستانے لگی، انھیں تو محلے کے قصائی تک کی یاد آنے لگی۔ بس انھیں دونوں ایک ساتھ، ایک ہی وقت، ایک ہی جگہ پر چاہیئے تھے تاکہ اُن کو سکون مل سکے اور تنہائی اور بے قراری دور ہو۔ ''محاصرہ'' میں مصنّف کی ماں کبریٰ بیگم کا اپنے آبائی محلے سے لگاؤ اتنا ہی تھا جتنا منٹو کے افسانہ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' میں بشن سنگھ کو تھا۔ خیر بظاہر تو بِشن سنگھ پاگل تھا لیکن ان کا موازنہ اس بات پر بن سکتا ہے کہ شعور کی سطح پر بشن سنگھ پاگل تھا مگر لاشعور کی سطح پر اپنے اندرون اور فطرت میں یہ دونوں اپنے آبائی گھروں کو لے کے ایک جیسے ہیں۔

اِن کے خاندان میں محبت و اتفاق نمایاں ہے۔ دنیا میں زیادہ تر لوگ شادی یا پروفیشنل زندگی میں اترنے کے بعد ماں باپ کو وقت نہیں دیتے ہیں لیکن ''محاصرہ'' میں مصنف کو اپنی ماں کا بہت خیال ہے۔ ایک مرتبہ تو مصنف نے ہر صورت میں اپنے آبائی محلے جانے کی ٹھانی کیوں کہ فون کرنے پر پتہ چلا کہ امی کی طبیعت خراب ہے۔ مصنّف تمام دنگوں کے باوجود گلیوں کوچوں سے ہوتے ہوئے آخر کار محلہ پہنچے۔ یہ صاف ظاہر کرتا ہے کہ

اُن کی طرف سے ماں پہ سب قربان تھا، بس مجبوری اس حد تک تھی کہ ماں کی جانب سے ایک حکم ہو جائے.....شاید اگر ماں کہتی کہ بیٹا کام چھوڑ کر یہیں رہو تو وہ ضرور چھوڑ دیتے لیکن ماں یہ نہیں چاہتی تھی۔ وہ جو کر رہا تھا ماں تو اس پہ خوش تھی۔ اِن دنگوں سے پہلے وہ ہفتہ وار مل کے واپس چلے جاتے تھے اور وہ اس بات پہ مکمل طور پر مطمئن تھی۔ اُن کو پریشانی تب ہوئی جب اُن کے ہی بچے ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے فساد دنگوں کی وجہ سے ملنے سے قاصر رہے۔ مصنف کو جب پتہ چلا کہ اب تو امی سے ملنا ضروری ہے تو انھوں نے اپنی جان کی پروا نہیں کی اور زبان پہ ایک ہی فقرہ نمودار ہوا کہ "ماں کو کچھ نہ ہو جائے.....اماں کو کچھ نہ ہو جائے۔" اور یہ ایک اعلیٰ خاندانی پہلو ہے، جہاں دو طرفہ محبت، خلوص، اور عزت و احترام دکھائی دیتا ہے۔ اس افسانے میں ایک بار بھی (disrespect) کا عنصر نہیں ملا۔ بس اگر کچھ ملا تو شدید احساس (absolute care) اور بے جا خاندانی اتفاق و اتحاد کا عنصر ملا۔

اس افسانے میں ہر کردار اپنی نفسیاتی کیفیت کے لحاظ سے مختلف حالات کا سامنا کر رہا ہے۔ مرکزی کردار جو کہ مصنف خود ہے شدید بے بسی کا شکار ہے۔ اس کے پاس نہ ہی دولت کی کمی ہے اور نہ ہی کسی اور چیز کی لیکن اُن کا مسئلہ یہ ہے۔ جہاں وہ روزگار کی خاطر رہ رہا ہے وہ اسے چھوڑ نہیں سکتا اور جہاں وہ بچپن میں رہ رہا تھا وہاں فساد اور دنگوں کی وجہ سے حسب معمول جا نہیں سکتا ہے۔ ماں وہاں رہ نہیں سکی، اُن کو آبائی محلّہ یاد آتا ہے۔ بس مجبوری ہی مجبوری، شہر کے حالات، روزگار، اور اُن کی والدہ! اُن کی اماں تو یہی چاہتی ہے کہ صورتحال نارمل ہو جائے اور اُن کے بیٹے اُن سے ملنے آ جائیں۔ امّی کے لیے بچے، محلے والا گھر سب ایک وقت، ایک جگہ، کئی بار یعنی بار بار چاہیئے! آصف فرخی نے افسانے میں ماحول کے دباؤ سے پیدا ہونے والی محرومیوں اور کرداروں کی نفسیاتی کیفیتوں کو قاری تک پہنچانے کے لیے کرداروں کے مکالمات اور ان کی حرکات و سکنات کو نہایت خوبصورت سے پیش کیا ہے۔

آصف فرخی نے ''محاصرہ'' میں اپنا ایک اہم اسلوب تجریدی انداز کا استعمال کیا ہے۔ اس افسانے میں علامتوں کا بھرپور استعمال کیا گیا ہے تاکہ قاری کو ظاہری واقعات کے پیچھے چھُپے گہرے معنوں تک پہنچایا جاسکے۔ فرخی صاحب نے ''محاصرہ'' میں تجریدی انداز کا استعمال دنیا بھر میں سیاسی اور سماجی صورتحال کی عکاسی کے لیے استعمال کیا ہے۔ مکالمہ نویسی کی تھوڑی بہت بات پہلے بھی کی تھی لیکن ابھی دوبارہ سے روشنی ڈالنے کا مقصد آصف فرخی کے مکالمات کو سمجھنا ہے۔ ''محاصرہ'' میں اِن کے مکالمے نہایت ہی سادہ اور مختصر ہیں مثلاً مصنف نے فون پہ جب اماں سے بات کرتے ہوئے کہا کہ ''اماں کیسے آؤں؟ آپ کے ہاں تو اب بوری میں بند ہو کر آنا ہی ممکن ہے.....'' سامنے سے امّی کچھ دیر خاموشی کے بعد جواب دیتی ہے ''بوری میں بند ہو کر؟ الٰہی خیر.....'' اس مکالمے سے قاری کو یک دم سب کچھ معلوم ہوتا ہے اور مزید کسی بھی تفصیل کی ضرورت نہیں رہتی ہے۔ اگر تفصیل بھی ہو تو وہ ضائع ہے کیوں کہ کوئی ضرورت ہی نہیں۔

''محاصرہ'' میں آصف فرخی نے بہت ہی خوبصورت انداز میں منظر نگاری اور ماحول کی تشکیل کی ہے۔ وہ اپنے الفاظ کے ذریعے قاری کے سامنے کہانی کا ماحول واضح طور پر پیش کرتے ہیں۔ شہر، گلیاں، کرداروں کی حرکات و سکنات اور ماحول کی تفصیل ایسی ہوتی ہے کہ قاری خود کو کہانی کا حصہ محسوس کرتا ہے۔ مثلاً افسانے میں مصنّف یادِ ماضی میں گم ہو کر کچھ یوں فرماتے ہیں کہ ''اس محلے کی ساری گلیاں میری دیکھی بھالی ہیں۔ دھوپ بھری دوپہریوں میں کرائے کی سائیکل لے کر یوں ہی گھومتے پھرنا، شام پڑے سے رات گئے تک..... کبوتر اڑانا اور پتنگ کے پیچ لڑانا..... پھر رمضان میں تراویح کا کہہ کر غائب ہو جانا وغیرہ وغیرہ۔ میرے خیال میں اتنی اچھی منظر کشی بہت کم ہی افسانہ نگار کر سکتے ہیں۔ وہ اس لیے کہ اِن کی منظر کشی میں امید، یادِ ماضی (Nostalgia)، اور حالاتِ ماں کی زندگی کے رنگ بکھیر کر سامنے آتے ہیں۔ ''محاصرہ'' بنیادی طور پر سنگین حالات کے دوران انسانی نفسیات اور حالاتِ زندگی کی پیچیدگیوں کو ظاہر کرتا ہے لیکن ثانوی طور پر اگر دیکھیں تو اس میں ماں کا پیار، اور ماں

سے محبت جیسے اہم پہلو بھی نظر آتے ہیں جن کو سب کے گوش گزار کرنا عبادت سے کم نہیں ہے۔ ''محاصرہ'' کے اول سے آخر تک ماں کے اپنے بچوں (خاص طور پر مصنف) سے پیار کا اظہار بار بار آتا ہے۔ اور اپنے بچے کو ماں سے زیادہ کوئی پیار بھی نہیں کر سکتا ہے۔ دوسرا ثانوی پہلو پردیس ہے، پردیس اپنے گھر والوں سے دور ایک محنت کش انسان کا ٹائٹل (Title) ہے۔ سنگین حالات کی وجہ سے مصنف ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے اپنی ماں کے لیے ایک پردیس سے کچھ کم نہ تھا۔ اب ہم اِن دونوں کو ملا کر کچھ سوچے تو نتیجہ کچھ یوں نکلتا ہے کہ ماں سے زیادہ ہماری کوئی کمی محسوس بھی نہیں کر سکتا ہے۔ یعنی اگر ایک بیٹا پردیس میں ہو اور اُس کے والد اور والدہ کے بیچ اسے مِس (miss) کرنے میں مقابلہ ہو جائے تو والدہ محترمہ ہمیشہ بازی لے جائے گی۔ نہ ہی کوئی ماں سے زیادہ ہمیں پیار کر سکتا ہے اور نہ ہی ہمیں ماں سے زیادہ کوئی مِس (miss) کر سکتا ہے۔

علاوہ ازیں اس میں ماں سے محبت یعنی اولاد کا ماں سے محبت کا پہلو نمایاں ہے۔ مصنف کو اپنی ماں سے انتہائی محبت اور عقیدت ہے۔ انھوں نے پورے افسانے میں ماں کی ہر بات مانی اور شدید حالات کے باوجود بھی اپنی ماں کو اوّل درجے میں رکھا۔ لیکن مصنف نے سچائی کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑا چاہے فون پر اُن کی ماں ہی کیوں نہ بات کرتی ہو۔ جب ماں کا فون آیا اور ماں جی نے کشیدہ حالات کے باوجود گھر آنے پر اصرار کیا تو مصنف نے سچ سچ بات بتائی کہ وہ ابھی نہیں آسکتے۔ اور اگر آیا بھی تو صرف بوری میں بند ہو کے آسکتے ہیں۔ اس کا احساس تھا کہ اس بات سے ماں کیا سوچے گی یا کیا محسوس کرے گی لیکن انھوں نے سچ بولا کہ حالات بالکل بھی ساز گار نہیں ہیں۔ جہاں سچ بولنا چاہیئے تھا وہاں وہاں انھوں نے سچ ہی بول دیا۔ اس چیز سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کبھی کبھی انسان محبت میں اتنا احتیاط برتنے کی کوشش کرتا ہے کہ آہستہ آہستہ وہ حقیقت سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس لیے مصنف چاہتا ہے کہ سچائی سے دوری محبت کا تقاضا ہے بھی نہیں۔ محبت اندھی نہیں ہونی چاہیئے، بس جو حقیقت ہے اُس کو دلیری سے بتا دینی چاہیئے۔ اگر اس دن مصنف چلا جاتا تو شاید اس کی جان بھی جا سکتی تھی، جس سے ماں جی کو

اور بھی دکھ ہوتا اور وہ زندگی بھر خود کو کوستی کہ بیٹے کی موت کی ذمہ دار وہ خود ہے۔ مصنف نے حقیقت کا ساتھ دے کر ماں کو کئی گنا زیادہ دکھ سے بچالیا۔ دھنگوں کی وجہ سے ہفتوں کی بجائے بیٹے کی شکل مہینوں میں دیکھنے کو ملتی تھی لیکن اگر اُس دن محبت کے نشے میں دھند ہو کر چلا جاتا تو شاید ماں جی کو آخری سانس تک بیٹے کی دیدار نصیب نہیں ہوتی۔ محبت میں ہوشیاری کا عنصر سب سے اہم ہیں، حقیقی محبت میں بیوقوفی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ تاریخی طور پر محبت کو ہمارے انسانی معاشرے میں دلیری سے جوڑا گیا ہے، لیکن یہ دیکھے بغیر کی دلیری کے اندر ہوشیاری اور بیوقوفی کا تناسب کیا ہے۔ بدقسمتی سے محبت کو کچھ خیالی شکنجوں میں پھسایا گیا ہے۔ ہمارے معاشروں میں محبت کرنے والے کو اپنی محبت کا ثبوت یہ دے کر کرنا پڑتا ہے کہ وہ محبوب کے لیے چاند توڑ کر لائے گا، وہ محبوب کے لیے دریا پار کر دے گا۔ سوال یہ ہے کہ کیا وہ چاند توڑ کر لا سکتا ہے؟ کیا وہ دریائے سندھ میں کود سکتا ہے؟ پس بات یہی ہے بلکہ آپ شکایت کہہ لے کہ پگال پن کو محبت جیسی مقدس شے سے نہیں جوڑا جائے۔ پھر جب لوگ بات کرتے ہیں کہ یہ شخص وہ شخص، فلاں آدمی، اور بتاں آدمی..... محبت میں پاگل ہو کر پاگل خانے میں ہے۔ محبت میں تو انسان سیکھتا ہے اور پہلے سے کئی گنا زیادہ میچور ہوتا ہے۔ کیا تعلیم یافتہ انسان اَن پڑھ کہلا سکتا ہے؟ ہاں تعلیم کے بعد بھی لوگ جاہل کہلا سکتے ہیں لیکن اَن پڑھ نہیں کہلا سکتے ہیں۔

حالات جیسے بھی ہوں لیکن مصنّف کے اندر یہ انسانی خصوصیت اعلیٰ ہے، اس طرح کے انسان بننے کے لیے بہت زیادہ میچورٹی، ہمت و حوصلہ، طبیعت میں ٹھہراؤ، اور شعور کی ضرورت ہوتی ہے۔ مصنّف کی ماں، کو بھی آخر حالات کی سمجھ آجاتی ہے اور وہ جب اس مرتبہ فون پہ بات کرتی ہے تو کچھ یوں کہتی ہے کہ ”آج ادھر مت آنا بیٹے۔ چاروں طرف سے بری خبریں آرہی ہیں۔ اس طرف کا ارادہ بھی مت کرنا۔ جب تک حالات نہ سنبھل جائیں۔ ماں صبر کرلے گی بیٹا، بس تم خیریت سے رہو، جیتے رہو۔“ ہم اگر اس خصوصیت کو محبت میں شامل کر کے اور پانے سے زیادہ جس سے محبت ہو اُس کا اِس دنیا میں ہونے کا خیال کر لیں تو دنیا میں اعلیٰ انسانوں کی تعداد میں

اضافہ ہی ہو گا۔

یہاں سے اگر کوئی اور بات سیکھ سکتے ہیں تو وہ یہ ہے کہ ایسے حالات میں بھی رشتوں کا خیال کیا رکھا جائے۔ حالات سے شکایت اور شکست کے بجائے حالات سے مقابلہ اور حالات کے مطابق اپنی زندگیوں کو (adjust) کرنا لازمی ہے جو کہ افسانے میں نمایاں ہے۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ بغیر سمجھ بوجھ کے کسی سیاسی جماعت کا ساتھ دینا، یا کسی سیاسی جماعت کے خلاف ہونا، غیر ضروری تحریکوں اور تنظیموں کا حصّہ ہونا، یہ سب چیزیں انسانی، سیاسی اور سماجی المیے کا باعث بنتی ہیں۔ کیوں کہ اس میں متاثرہ لوگ عوام ہوتے ہیں۔ اِن خطرناک سرگرمیوں سے اجتناب لازمی ہے ورنہ لوگ ہمیں گمراہ کن بیانیوں کے ذریعے مال مویشیوں کی طرح اپنے اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرتے رہیں گے اور خود اپنے لیے ٹھنڈے کمروں میں گھوڑے بیچ کر سو رہے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ہم میں اور جانوروں میں یہی فرق رکھا ہے کہ ہمیں کوئی بھی کام کرنے سے پہلے اپنے شعور کا استعمال کرنا چاہیئے۔ اگر شعور کا دخل نہیں ہوا تو انسان بھی بدترین جانور بن جاتا ہے جس طرح منٹو کے افسانے "کھول دو" میں نظر آتا ہے، انسان اندھا دھند بیانیوں کی وجہ سے بَلوائیوں کا حصّہ بن جاتا ہے اور اسے پتہ بھی نہیں چلتا ہے۔ اس دوران وہ غیر انسانی حرکات پر بھی اتر سکتا ہے۔ انسان تو ایک وقتی مخلوق ہے جس کی فطرت حالات سے منسلک ہے۔ انسان تو (Situational) ہے۔ اور جب سب انسان بغیر سوچے سمجھے ایسے ایکٹ کرنے لگیں تو معاشرہ افسانے میں موجود صورتحال کے مصداق ہو جاتا ہے۔ ایسی صورتحال کو روکنے کے لیے پھر دنیا کے پاس کوئی لائحہ عمل ہی نہیں ہوتا بس وقت کا انتظار کرنا پڑتا ہے کہ کہیں کوئی معجزہ ہو جائے اور حالات خود نارمل ہو جائیں لیکن اُس دوران اس کی جڑیں اتنی گہری ہوتی ہیں کہ انسانی شعور کے علاوہ کوئی اور چیز اسے روک ہی نہیں پاتی، روک ہی نہیں پاتی۔

ہمارے معاشرے کا بھی یہی حال ہے۔ صدیوں پرانے بلوے، دشمنیاں، اختلافات اور بے بنیاد

نظریات ہم بھلا نہیں سکے۔ مجھے نہیں پتہ کیوں، لیکن اتنا اندازہ ہے کہ ہمیں لوگوں نے کیسے لڑایا۔ ہمارے معاشرے میں زبان، نسل، رنگ، ذات، مذہب، فرقے، صوبائیت جیسے عوامل کو ہم میں instrumentalize کیا گیا۔ دو بھائیوں کو اقتدار جیسی چیز پہ instrumentalize کیا اور اُن کو لڑایا گیا۔ آج کل بھی معاشرے میں یہی حال ہے۔ اگر اس کو مزید خوردبین سے دیکھیں تو انسٹرومینٹلائزیشن (instrumentalization) کے اس عمل نے ہمارے وجود میں منافقت پیدا کی ہوئی ہے۔ منافقت ہمارے خون میں رچی بسی ہوئی ہے۔ کیوں کہ ہم سمجھ کے باوجود بھی انسانوں کو انٹرومینٹل نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور نتیجے میں ہمارے حالات آپ کے سامنے ہیں۔ بس جو ہوا سو ہوا، اب ہمیں ماضی پہ ہی ملبہ نہیں ڈالنا چاہیئے۔ یہ بات کہتے ہوئے مجھے کومل جوئیہ کا ایک شعر یاد آرہا ہے۔

میں اپنے خدوخال ہی پہچان نہ پائی
گزرا ہے یہاں وقت بڑی دھول اڑا کے

ہاں تو میں بات کر رہا تھا اُن انسٹرومینٹس کی جن کی وجہ سے ہمارا معاشرہ تباہ حال ہے۔ کیا ہمیں اب بھی سر پکڑ کر بیٹھنا چاہیئے کہ بس ہمارے ساتھ بُرا ہوا، اب ہم ٹھیک نہیں ہو سکتے، خود کو حقیر سمجھنا اور بہانہ بازی (excuses) کرنا۔ بہانہ بازی، بہانے تراشنا اور ماضی کو موردِ الزام ٹھہرانا، اُن معاشروں میں عام ہوتا ہے جو ماضی میں انسانی بحرانوں سے گُزرے ہیں، نو آبادیاتی استحصال کا شکار رہے ہیں، اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑے گئے ہیں۔ ایسے معاشروں کے افراد اکثر اپنی موجودہ ناکامیوں یا مسائل کا الزام ماضی پر ڈالتے ہیں اور اس بہانے سے خود کو نئی راہوں کی تلاش سے روک لیتے ہیں۔ یہ رویہ نہ صرف معاشرتی ترقی میں رکاوٹ بنتا ہے بلکہ افراد کو اپنی خودی اور صلاحیتوں پر یقین قائم کرنے سے بھی دور کر دیتا ہے۔ ماضی کا بوجھ ہمیشہ ہمیں پیچھے کی طرف کھینچنے کی طاقت رکھتا ہے، لیکن اسے ترک کرنا اور ایک نئی شروعات کرنا ہی حقیقی آزادی اور فلاح کا راستہ ہے نہ کہ بغیر

سمجھے نعرے بازی کرنا، چند لوگوں کی سیاست کو چمکانے کے لیے ڈائیلاگ کے بجائے لڑائی پر اتر آنا۔ ہمیں ایک معاشرے کے طور پہ اپنی اپروچ (approach) کو تبدیل کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ اگر ہم اسی طرح رہے تو ایک گول نما چیز کے اندر گھومتے رہیں گے۔ آج حالات خراب نہیں تو کل ہوں گے۔ میری ذاتی رائے کے مطابق کالونیل ایسپیکٹس (aspects) کو ختم کرنا ہو گا، جس سے نظام میں تبدیلی آئے گی اور حالات "محاصرہ" میں دیئے ہوئے حالات سے تب ہی مختلف ہو سکتے ہیں۔

عرفان صدیقی فرماتے ہیں کہ:

ہمیں تو خیر بکھرنا ہی تھا کبھی نہ کبھی
ہوائے تازہ کا جھونکا بہانہ ہو گیا ہے

❋❋❋

محمد مجیب رضا بخاری

افسانہ ''ڈرائے گئے شہروں کے باطن'' فنی و فکری تجزیہ

تعارف

آصف فرخی کا افسانہ ''ڈرائے گئے شہروں کے باطن'' اردو ادب میں ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ یہ افسانہ نہ صرف ایک عام سڑک حادثے کی کہانی ہے بلکہ انسانی وجود، موت، اور سماجی بے حسی کے مسائل کی عکاسی کرتا ہے۔ افسانے کی ابتدا ایک بیٹے کے خوفناک تجربے سے ہوتی ہے جب وہ ایک سڑک حادثے کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اس کے بعد کی گفتگو ماں اور بیٹے کے درمیان نہ صرف ان کے ذاتی تجربات کو سامنے لاتی ہے بلکہ معاشرتی مسائل پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔

کہانی کی تفصیل

افسانے کی ابتدا ایک بیٹے کے خوف سے ہوتی ہے، جو سڑک پر ایک خون آلود مرد کی لاش دیکھتا ہے۔ یہ منظر اس کی زندگی پر گہرے اثرات چھوڑتا ہے۔ جب وہ اپنے گھر پہنچتا ہے تو اپنی ماں کو اس واقعے کے بارے میں بتاتا ہے، جس سے ماں کی حالت بھی متاثر ہوتی ہے۔ یہ پہلا منظر ہمیں انسانی جذبات کی گہرائی کی جانب متوجہ کرتا ہے۔ بیٹے کی طرف سے ماں کو بتانے کا عمل اس کی معصومیت کو ظاہر کرتا ہے، جب کہ ماں کی خاموشی اور حیرت اس واقعے کی سنگینی کی عکاسی کرتی ہے۔

اس کے بعد، بیٹا اخبار پڑھتا ہے، جس میں ملک کی صورت حال کے بارے میں خبریں شامل ہیں، جن میں یہ ذکر ہے کہ لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال کر قتل کیا جائے گا۔ یہ نکتہ افسانے کی فکری گہرائی کو بڑھاتا

ہے۔ یہاں پر سوال یہ ہے کہ کیا ہم صرف سڑک حادثات کے خوف میں جیتے ہیں یا ہمیں اپنی زندگیوں کے حقیقی خطرات کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے؟

نفسیاتی تجزیہ

افسانے میں بیٹے کے تجربات کی نفسیاتی نوعیت کو سمجھنا ضروری ہے۔ وہ حادثہ جو اس نے دیکھا، صرف ایک واقعہ نہیں بلکہ اس کی زندگی کی حقیقتوں کی عکاسی کرتا ہے۔ جب وہ سڑک پر مختلف منظر ناموں کو یاد کرتا ہے، تو وہ خود کو اس خطرے میں تصوّر کرتا ہے جو اس کے ارد گرد موجود ہے۔ یہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ انسانی زندگی کی نوعیت کیسی غیر محفوظ ہے۔

بیٹے کا اپنے آپ کو ممکنہ طور پر ان لوگوں میں شامل سمجھنا جو اس ممکنہ قتل کے خطرے میں ہیں، اس زندگی کی ناپائیداری کا احساس دلاتا ہے۔ جو ہر انسان کی زندگی میں موجود ہوتا ہے، خاص طور پر ایسے حالات میں جہاں انسانی جان کی قدر کم ہو رہی ہو۔

تنہائی کا موضوع (ویرانی)

افسانے میں "ویرانی" یا تنہائی کا موضوع بھی نمایاں ہے۔ بیٹے کے خوفناک تجربے کے بعد جب وہ اپنی ماں کے سامنے آتا ہے، تو وہ ایک ایسی تنہائی میں ہے جہاں اس کے احساسات کی کوئی قدر نہیں۔ وہ خود کو ایک اندھیری دنیا میں کھویا ہوا محسوس کرتا ہے، جہاں موت کی حقیقت اور سڑک حادثے کے اثرات اس کے ذہن میں گونج رہے ہیں۔

بیٹا نہ صرف جسمانی طور پر گھر واپس آتا ہے بلکہ اس کی روحانی حالت اسے: "خود سے علیحدگی" کی عکاسی کرتی ہے۔ وہ اپنی ماں سے باتیں کرتا ہے، مگر اس کے اندر کا خوف اسے اپنے خیالات میں مزید تنہا کر دیتا ہے۔ یہ تنہائی اس کے لیے ایک بھوت کی مانند ہے جو اسے ہر لمحہ اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے۔

ماں کا بیٹے کے خوف کو محسوس کرنا اور اس کی خاموشی میں موجود درد کو سمجھنا، ماں کا کردار ان کے درمیان محبت اور ہمدردی کی علامت ہے۔ ماں کی بے بسی، بیٹے کے خوف و ہراس کے احساسات کو اور بھی گہرا کر دیتا ہے۔ اس کا تعلق بیٹے کے لیے ایک سہارا بننے کی بجائے، اس کی تنہائی کو مزید بڑھاتا ہے۔

سماجی تنقید

آصف فرخی کا یہ افسانہ سماجی تنقید کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ اس میں جو خطرات اور ان سے جڑی جو تشویش بیان کی گئی ہے، وہ نہ صرف فرد کے تجربات ہیں بلکہ پورے سماج کے لیے بھی ایک انتباہ ہیں۔ لوگوں کے گھروں سے نکالے جانے کا خوف، معاشرتی بے حسی کا مظہر ہے۔ یہ بتاتا ہے کہ ہم ایک ایسے دور میں جی رہے ہیں جہاں انسانی زندگی کی کوئی قیمت نہیں رہی۔

بیٹے کا اندرونی خوف

بیٹے کی شخصیت کے اندرونی خوف کو بھی سمجھنا ضروری ہے۔ وہ سڑک پر ایک بے جان جسم کو دیکھ کر خوفزدہ ہوتا ہے، اور پھر جب وہ اپنے گھر میں بیٹھ کر اپنے حالات کا جائزہ لیتا ہے تو وہ اس خوف سے مزید متاثر ہوتا ہے۔ یہ اس کو زندگی کی تلخیوں کا احساس دلاتا ہے۔

علامتی معانی

افسانے میں شیشے کے ٹکڑے کا توڑنا ایک علامت کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک منفی واقعہ ہے جو بیٹے کی زندگی میں ہنگامہ اور بے چینی کی عکاسی کرتا ہے۔ شیشے کے ٹکڑے کا زخم کھانا، نہ صرف جسمانی نقصان کی نشاندہی کرتا ہے بلکہ یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ کس طرح ہم زندگی کے مختلف پہلوؤں سے متاثر ہوتے ہیں۔

اخباری خبر کا اثر

بیٹے کے لیے جب وہ خبر پڑھتا ہے کہ لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال کر قتل کیا جائے گا، تو اس کا

ذہن اس بات کی جانب متوجہ ہوتا ہے کہ یہ صرف ایک عام خبر نہیں ہے بلکہ اس کی زندگی، اس کے رشتہ داروں اور دوستوں کے لیے ایک ممکنہ خطرہ ہے۔ یہ ایک خطرناک صورت حال کی عکاسی کرتا ہے، جہاں ہر شخص اپنی زندگی کی بقا کی جنگ لڑ رہا ہے۔

بیٹے کے ذہن میں اس خبر کے بعد دیگر لوگوں اور خاص طور پر اپنے: رشتہ داروں کا خیال آتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ آیا اس کے رشتہ دار بھی اس خطرے سے محفوظ ہیں یا نہیں۔ یہ خیالات اسے مزید خوف میں مبتلا کر دیتے ہیں، اور وہ سوچتا ہے کہ اگر ایسا ہوا تو اس کے پیارے بھی اس عذاب کا شکار ہو سکتے ہیں۔

خود کی شناخت کا سوال

جب بیٹا ان خیالات میں غرق ہوتا ہے، تو وہ خود سے سوال کرتا ہے کہ آیا وہ بھی اس قتل عام کا حصہ بن سکتا ہے۔ یہ سوال انسانی وجود کی ناپائیداری کی عکاسی کرتا ہے۔ وہ اپنے ارد گرد کے لوگوں کے بارے میں سوچتا ہے اور یہ احساس کرتا ہے کہ ہم سب ایک دوسرے کے لیے کتنے غیر محفوظ ہیں۔

انسانیت کی کمی

افسانے میں جو عناصر موجود ہیں، وہ انسانیت کی کمی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ بیٹا جب سڑک پر خون آلود لاش کو دیکھتا ہے، تو وہ صرف ایک جسم نہیں بلکہ ایک زندگی کی ناکامی کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ ہم اپنے ارد گرد کی دنیا کے حوالے سے کس قدر بے حس ہو چکے ہیں۔

انسانی زندگی کے قیمتی لمحات

افسانہ ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ ہم اپنی زندگی کے قیمتی لمحات کو کس طرح گُزار رہے ہیں۔ کیا ہم صرف اپنے ذاتی خوف اور تجربات میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں، یا ہم اپنے ارد گرد کے لوگوں کے بارے میں بھی سوچتے ہیں؟ بیٹے کی ماں کی خاموشی ہمیں یہ یاد دلاتی ہے کہ کبھی کبھار سب سے زیادہ دردناک بات وہ ہوتی

ہے جو ہم کہہ نہیں پاتے۔ اس خاموشی میں ایک گہرا سمجھوتہ ہے جو اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ انسانی رشتے کتنے نازک ہیں۔

موت کا خوف

افسانے میں موت کا خوف ایک مرکزی موضوع ہے۔ جب بیٹا سڑک پر ایک خون آلود مرد کو دیکھتا ہے، تو وہ اس واقعے کے اثرات سے خود کو بچانے کی کوشش کرتا ہے، لیکن یہ خوف اس کے ذہن میں بیٹھ جاتا ہے۔ یہ تجربہ نہ صرف اس کی زندگی میں ایک خوفناک لمحہ ہے، بلکہ یہ موت کی حقیقت کو بھی سامنے لاتا ہے۔ اس کی سوچیں اس کے ذہن میں اس وقت گونجتی ہیں جب وہ سوچتا ہے کہ کیا وہ ابھی اس خطرے میں ہے جو اس لاش کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔

اجتماعی درد

جب بیٹا اپنے ملک میں جاری بے حسی کی خبروں کو سنتا ہے، تو وہ اپنے رشتہ داروں کے بارے میں سوچتا ہے۔ یہ احساس کہ دوسرے بھی اس خطرے کا شکار ہو سکتے ہیں، اسے اکیلا نہیں محسوس کرواتا، بلکہ اس کے اندر ایک اجتماعی درد کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ یہ دکھ، درد اور خوف کا احساس ایک مشترکہ انسانی تجربہ ہے جو ہمیں ایک دوسرے کے قریب لاتا ہے۔

ویرانی کا مظہر

اس افسانے میں ویرانی کی حالت صرف بیٹے اور ماں کے تعلقات میں نہیں بلکہ معاشرتی نظام میں بھی موجود ہے۔ یہ ویرانی اس بات کا ثبوت ہے کہ ہم اپنے مسائل کے حل کے بجائے، ان سے نظر چرا رہے ہیں۔ سڑک پر ایک لاش، اخبار میں شائع ہونے والی خوفناک خبریں، اور ماں کی خاموشی، یہ سب مل کر ایک سوسائٹی کی حالت زار کو ظاہر کرتے ہیں جو مسلسل خوف اور بے حسی میں گھری ہوئی ہے۔

تنہائی اور عدم تحفظ

بیٹے کا اپنے خوف کا سامنا کرتے وقت محسوس کرنا کہ وہ اکیلا ہے، اس کی اندرونی حالت کا مظہر ہے۔ یہ اکیلا پن اسے ہر لمحے متاثر کرتا ہے، اور وہ خود کو اس بات کے لیے تیار کرتا ہے کہ وہ اس عدم تحفظ کے دور میں اپنی زندگی کو کس طرح گُزارے گا۔ افسانہ، اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ جب ہمیں اپنے ارد گرد کی دنیا سے خوف محسوس ہوتا ہے، تو ہم اپنے اندر ایک خاص قسم کی تنہائی کا تجربہ کرتے ہیں۔

اختتام پر سوال

جب افسانہ ختم ہوتا ہے، تو یہ سوال ابھرتا ہے کہ یہ آواز کیا تھی؟ یہ سوال نہ صرف اس کے جسمانی تجربے کی عکاسی کرتا ہے، بلکہ یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ زندگی میں بہت سی آوازیں ہمیں متاثر کرتی ہیں، چاہے وہ خوشی کی ہوں یا درد کی۔ اس آواز کے پس پردہ انسانی زندگی کی سچائی چھپی ہوئی ہے، جو ہمیں یاد دلاتی ہے کہ ہم کس طرح ایک دوسرے کے ساتھ جُڑے ہوئے ہیں۔

معاشرتی بے حسی کا اثر

افسانے کا ایک اور اہم پہلو معاشرتی بے حسی کا اثر ہے۔ یہ بے حسی صرف ایک فرد کی زندگی میں نہیں بلکہ پورے سماج میں موجود ہے۔ یہ افسانہ ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ کیا ہم اپنے ارد گرد کی دنیا کے بارے میں بے فکر ہو چکے ہیں؟ جب بیٹا سڑک پر ایک خون آلود لاش دیکھتا ہے، تو وہ سوچتا ہے کہ یہ صرف ایک واقعہ ہے، لیکن اس واقعے کے پیچھے جو کہانی ہے، وہ اس کی زندگی پر گہرے اثرات ڈال سکتی ہے۔

انسانی زندگی کی حقیقت

آصف فرخی کا یہ افسانہ ہمیں انسانی زندگی کی حقیقتوں کا سامنا کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ یہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ہمیں اپنے ارد گرد کی دنیا کے ساتھ جُڑے رہنے کی ضرورت ہے۔ جب ہم اپنی زندگیوں میں اس طرح کے

تجربات کا سامنا کرتے ہیں، تو ہمیں اپنی انسانی نوعیت کو بھولنے کی بجائے، ایک دوسرے کے ساتھ تعلقّات کو مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔

نتیجہ

آصف فرخی کا افسانہ ''ڈرائے گئے شہروں کے باطن'' انسانی جذبات، سماجی مسائل، اور وجودی سوالات کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ افسانہ ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دیتا ہے کہ زندگی کی ہر لمحے کی اہمیت ہے، اور ہمیں اپنی زندگی کے تجربات کو سمجھنے اور ان سے سیکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ ہمیں ایک انسانی تجربے کی صورت میں پیش آتا ہے جو ہمیں یہ یاد دلاتا ہے کہ ہمیں ہمیشہ اپنے ارد گرد کی دنیا کے ساتھ جُڑے رہنے کی ضرورت ہے۔

اختتام

آخر میں، یہ کہنا ضروری ہے کہ آصف فرخی کا یہ افسانہ محض ایک افسانہ ہی نہیں۔ بلکہ انسانی زندگی کی پیچیدگیوں کا عکاس ہے ایک آئینہ بھی ہے۔ یہ ہمیں خود کو سمجھنے اور اپنے ارد گرد کی دنیا کو بہتر بنانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ ''ڈرائے گئے شہروں کے باطن'' ہمیں یہ یاد دلاتا ہے کہ زندگی کے قیمتی لمحات کو سمجھنے کے لیے ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ جُڑے رہنے کی ضرورت ہے، اور ہمیں اپنی بنیادی انسانی اقدار کو کبھی بھی بھولنا نہیں چاہیے۔

یہ افسانہ ہمیں اپنی زندگی کے تجربات کے بارے میں سوچنے کی دعوت دیتا ہے اور ہمیں اس بات کی اہمیت کا حساس دلاتا ہے کہ ہم کس طرح ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ ''ڈرائے گئے شہروں کے باطن'' ایک ایسا افسانہ ہے جو انسانی جذبات کی گہرائی اور سماجی بے حسی کی شدت کو پیش کرتا ہے، اور ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ ہم کس طرح اپنی زندگیوں کو بہتر بنا سکتے ہیں۔

❋ ❋ ❋

ایمن تنویر

افسانہ ”جانِ من و جانِ شما“ پر مکالمہ

خالدہ حسین کی کہانی ”جانِ من و جانِ شما“ (دو دوستوں کے درمیان مکالمہ)

علی: یار احمد! میں نے خالدہ حسین کا افسانہ ”جانِ من و جانِ شما“ پڑھا، اور سچ کہوں تو یہ کہانی میرے دِل و دماغ پر نقش ہو کر رہ گئی ہے۔

احمد: ہاں، یہ واقعی ایک گہری اور دل دہلا دینے والی کہانی ہے۔ خالدہ حسین کی تحریریں ہمیشہ انسانی نفسیات اور معاشرتی حقیقتوں کو بہت خوبصورتی سے بیان کرتی ہیں۔ تمہیں کہانی میں سب سے زیادہ کس چیز نے متاثر کیا؟

علی: سب سے زیادہ تو ماں کا کردار متاثر کُن ہے، اس کی بے بسی، اس کی محبت اور آخر میں اس کا ذہنی توازن کھو دینا..... سب کچھ دل کو دہلا دینے والا تھا۔ وہ دو بیٹوں میں پھنسی ہوئی تھی، جو بالکل متضاد راستوں پر چل رہے تھے۔

احمد: بالکل، ایک بیٹا فوجی کمانڈو تھا، جو ریاستی طاقت، قانون اور نظم وضبط کی علامت تھا، جب کہ دوسرا شدّت پسند بن چُکا تھا، جو اپنے نظریات کے مطابق دوسروں کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ اور دونوں کا انجام کیا ہوا؟ موت۔

علی: ہاں، دونوں کی موت نے ماں کو اندر سے توڑ دیا، وہ پہلے ہی ایک کمزور اور حسّاس عورت تھی، اوپر سے دونوں بیٹوں کا یوں ایک دوسرے کے ہاتھوں مارے جانا..... وہ برداشت نہ کر سکی اور آخر کار ذہنی

مریضہ بن گئی۔

احمد: میرے خیال میں اس کہانی میں تین المیے تھے۔ پہلا شہر اور معاشرے میں آنے والی تبدیلیاں ہیں۔ کہانی میں جب خالدہ واپس آتی ہیں تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ جس جگہ کو جانتی تھی اب وہ جگہ پہلے جیسی نہیں رہی۔ عمارتیں اونچی ہو گئی ہیں، راستے بدل چکے ہیں، اور سب کچھ ایک اجنبی ماحول جیسا محسوس ہوتا ہے۔

علی: ہاں، اور وہ خالدہ حسین کا جُملہ پڑھا تھا تم نے، جب وہ برگد کے پیڑ کو دیکھتی ہے؟ شاید درخت، اگر وہ انسانی دستبرد سے بچ جائیں تو انسانوں سے زیادہ پائیدار ہوتے ہیں۔ یہ جُملہ میرے دِل کو چھُو گیا۔

احمد: جیسے وہ درخت آج تک پائیدار ٹھہرا ہے، ویسے ہی فریدہ اتنے دکھ جھیلنے کے بعد بھی اکیلی کھڑی ہے۔

علی: اور جیسے شہر خالدہ کو پہچان میں نہیں آتا، ویسے ہی ماں کو اپنی زندگی کا سکون واپس نہیں ملتا۔ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ اجنبی ہو گئے ہیں۔

احمد: دوسرا المیہ یہ ہے کہ لوگ وطن سے سات سمندر پار جا کر، پیچھے رہ جانے والوں کا حال احوال تک نہیں پوچھتے۔ اپنی اتنی گہری دوست کے بارے میں خالدہ نے خبر ہی نہ رکھی کہ کب اس کا شوہر عقیدے کی وجہ سے اُسے چھوڑ گیا، کب اس کے دونوں بیٹے مارے گئے اور کب وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی۔

علی: حالاں کہ فریدہ ضرور اس کا حال احوال رفّو آپا سے پوچھتی رہتی تھی۔ وہ اس کی زندگی سے واقف تھی۔

احمد: صحیح کہا تم نے! اور تیسرے المیے کے بارے میں تو ہم گفتگو کر ہی چُکے ہیں۔ ماں باپ کا مختلف عقیدوں سے ہونا پہلے ہی دو مختلف دنیاؤں کا امتزاج تھا۔ شاید اس لیے ہی دونوں بچوں میں تضاد آیا؟

علی: ہاں، میں نے بھی یہی محسوس کیا۔ کہانی دراصل صرف ایک خاندان نہیں بلکہ پُورے معاشرے کی نمائندگی کرتی ہے جہاں نظریاتی شدّت پسندی، عام لوگوں، خاص طور پر والدین کے لیے تکلیف دہ

صورتِ حال پیدا کر دیتی ہے۔

احمد: خالدہ حسین کی سب سے بڑی مہارت یہی ہے کہ وہ علامتی اور استعاراتی انداز میں معاشرتی مسائل پر روشنی ڈالتی ہیں۔

❋ ❋ ❋

سیدہ کبریٰ عباس

ایک افسانے پر مکالمہ

کبریٰ اور بتول، دو سہیلیاں ایک دوسرے کو لائبریری سے نکلتے ہوئے ملتی ہیں۔

کبریٰ: اسلام علیکم! تم یہاں کیسے؟

بتول: وعلیکم اسلام، کیا حال ہے؟ مجھے چند اردو کی کتابیں چاہیئے تھیں، اس لیے یہاں آ گئی۔

کبریٰ: میں بالکل ٹھیک۔ اچھا؟ دکھاؤ کون سی کتابیں لائی ہو۔

بتول: یہ دیکھو، پانچ چھے ناول اور افسانوں کی ہیں۔ ابھی لائبریری کے اندر بیٹھ کر میں خالدہ حسین کا ایک بے حد خوبصورت افسانہ پڑھ رہی تھی۔

کبریٰ: اچھا؟ کون سا افسانہ؟

بتول: ”جانِ من وجانِ شما“، بہت خوبصورت علامتی رنگ میں لکھا گیا ہے۔

کبریٰ: واہ، کیا کہہ رہی ہو؟ میں نے بھی یہی افسانہ کل رات کو پڑھا ہے۔ مجھ پر تو اس کا بہت گہرا اثر ہوا۔

بتول: یہ کیسا اتفاق ہے، واہ!

کبریٰ: اس افسانے کو پڑھنے کے بعد میں ایک بہت گہری سوچ میں پڑ گئی تھی۔ افسردہ بھی تھی مگر یہی اس معاشرے کے تلخ حقائق ہیں۔

بتول: ہاں صحیح کہتی ہو۔ افسانے میں ایک نظریہ مصنّفہ کا اپنا ہے، اور ایک ان کی دوست فریدہ کا۔

بتول: ہاں مصنفہ کا اپنا نظریہ تو وقت کے ساتھ ساتھ ملک اور لوگوں کے تبدیل ہو جانے کا ہے۔ وہ شروع میں

جب اپنی دوست فریدہ کی کوٹھی ڈھونڈ رہی ہوتی ہیں تو سوچتی ہیں کہ کیسے کوٹھیوں کی جگہ نئی اور اونچی عمارتوں نے لے لی ہے۔

کبریٰ: ہاں، اور پھر وہ اپنی دوست فریدہ کا ذکر کرتی ہیں کہ وہ اسے سولہ برس بعد ملنے جا رہی ہیں اور کیسے فریدہ کی شادی اپنے مسلک کے باہر ہوئی ہوتی ہے۔

بتول: پھر جب وہ آخر کار فریدہ کے گھر پہنچ جاتی ہیں تو فریدہ بہت ٹھنڈے طریقے سے ان کا استقبال کرتی ہے۔

کبریٰ: ہاں یہ بات خالدہ کو بہت عجیب لگی تھی، اور مجھے بھی۔

بتول: ہاں مجھے بھی، مگر جب آگے جا کر فریدہ کا کردار اور نفسیاتی حالت ہم پر مزید کھُلتی ہے تو پھر سمجھ میں آنے لگتا ہے۔

کبریٰ: خالدہ بھی بہت تجسّس میں ہوتی ہیں، کہ آخر فریدہ کو کیا ہوا۔ اور پھر بعد میں آہستہ آہستہ پتہ چلتا ہے کہ فریدہ کا شوہر اس کے عقیدے کی وجہ سے اس سے علیحدہ ہو گیا، اور اس کا ایک بیٹا مبین، آرمی میں ہے اور.....

بتول: اور خرم تو خود کش حملہ آور نکلا، کیسا صدمہ لگا ہو گا ماں کو۔

کبریٰ: ہاں، وہ فریدہ کی نفسیاتی حالت دیکھ کر پڑھنے والے کو نظر بھی آتا ہے، کہ جیسے وہ اپنے بچوں کو یاد کرتی ہے اور پھر موضوع بدلنے کی کوشش کرتی ہے۔

بتول: کہانی کے اختتام پر جب یہ پتہ چلا کہ خُرم اسی کے بھائی مبین والے ہی آپریشن ''راہ راست'' میں مارا گیا، تو مجھے سمجھ نہیں آئی کیا محسوس کروں۔

کبریٰ: ہاں بالکل ٹھیک کہتی ہو، مگر کیا حوصلہ تھا فریدہ کا کہ صحیح فیصلے کی خاطر ایک بیٹے کو دوسرے بیٹے کی جان

لینے کی اجازت دے دی۔

بتول: بہت حوصلے والی ماں تھی۔ شاید یہ ایک علامت ہے کہ کیسے مذہبی شدّت پسندی کے تحت ایک ہی ملک میں رہنے والے مختلف لوگ ایک دوسرے کو مذہب کے نام پر مار دیتے ہیں۔

کبریٰ: ہاں ایسا ہی ہے۔ یاد ہے ناسوات میں جو حملے اور دہشت گردی ہوئی تھی اس میں بھی یہی سب کچھ ہُوا تھا۔

بتول: ہاں، مصنّفہ ہم لوگوں کو یہی پیغام دینا چاہتی ہیں۔

کبریٰ: ہاں اور یہ بھی کہ وہ کیسے یادوں میں گم ہیں، ابھی تک ماضی میں ہیں اور بچوں کی موت کا یقین نہیں کر سکی۔

کبریٰ: شاید، وہ پائیدار درخت فریدہ کی مضبوطی کی علامت بھی ہو۔

بتول: ہاں شاید، بہت خوبصورت افسانہ تھا۔

کبریٰ: بے حد، چلو میں اب چلتی ہوں، خدا حافظ۔

بتول: خدا حافظ، بہت اچھا لگا تم سے مل کر آج۔

کبریٰ: مجھے بھی!

❋ ❋ ❋

عائشہ شہوار

افسانہ ”درزی“ پر نوٹ

اس کہانی میں شمی اور روحی رات کے دو بجے عید کے زمانے میں درزی کی تلاش میں نکلی تھیں۔ وہ لاہور کے بازار میں تھیں اور ادھر بے حد رش تھا۔ شمی کے لیئے عید کے کپڑے سلوانا بہت ضروری تھا اور روحی اس بات سے متفق نہیں تھی۔ شمی کو یہ لباس عید سے پہلے پہننا تھا اور عید کے رش میں کوئی درزی حامی نہیں بھر رہا تھا۔ وہ دونوں شہر میں درزی کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی تھیں۔ رات کی تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک دم سے ان کو ایک پرندے کی آواز آئی اور وہ ڈر گئیں۔ شہر کے بازار کے بعد وہ لبرٹی مارکیٹ کے درزیوں کے پاس بھی گئیں لیکن کسی نے حامی نہ بھری۔ مایوس ہو کر وہ واپس جا رہی تھیں کہ ایک دم سے ایک آدمی ان کے سامنے آ گیا اور یوں انھوں نے یک دم بریک لگا کر اسے پوچھا کہ وہ کون ہے اور کیا وہ اپنے ہوش میں ہے۔ شمّی کو لگا کہ وہ آدمی درزی ہے اور اس نے گاڑی سے اتر کر اس سے پوچھا۔ مثبت جواب ملنے پر شمّی نے اس کو اپنے گھر آنے کا کہا تا کہ وہ کپڑے سی دے۔ وہ آدمی سفید رنگ کے عجیب بے ڈھنگ سے لمبے لمبے کپڑوں میں تھا اور اس کی آنکھیں سفید تھی۔ یہ دیکھ کر روحی پریشان ہو گئی، لیکن شمّی کو درزی ملنے کی خوشی میں ان چیزوں سے کوئی فرق نہ پڑا۔ درزی سے جب پوچھا کہ وہ کس وقت آئے گا، تو اس نے کہا کہ اسی وقت۔ شمّی حیران ہوئی اور روحی پریشان۔ وہ رات بہت خاموش تھی۔ اندرونِ شہر میں عید کی رونق تھی لیکن گلبرگ میں رات کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ جب روحی نے شمّی کو درزی کی آنکھوں کے بارے میں بتایا تو شمی بھی پریشان ہوئی۔ گھر پہنچتے ہی شمّی نے زوناش کو درزی کے آنے کا بتایا اور وہ بھی متوحش سی ہو گئی۔ دوسرا دن شروع ہو کر ختم بھی ہو گیا کہ رات کو شمّی کی طبیعت ناساز ہو

گئی۔ دوائی کھائی لیکن شمی کی حالت بد سے بدتر ہو رہی تھی کہ اتنے میں دروازے کی گھنٹی بجی۔ وہاں درزی کھڑا تھا جو کہنے لگا کہ وہ کفن سینے آیا ہے۔

حجاب امتیاز علی مشہور ناول نگار تھیں۔ وہ ۴ نومبر ۱۹۰۸ء کو حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد سید محمد اسماعیل دکن ریاست کے پہلے سیکرٹری تھے۔ حجاب نے اردو، عربی اور موسیقی کی تعلیم حاصل کی اور ''تہذیب نسواں'' میں افسانے لکھنا شروع کیے۔ ۱۹۳۴ء میں امتیاز علی تاج سے شادی کے بعد لاہور میں منتقل ہو گئیں۔ ان کے مشہور کاموں میں ''میری ناتمام محبت'' اور ''نغمات موت'' شامل ہیں۔ وہ برِّصغیر کی پہلی خاتون پائلٹ بنیں۔ حجاب کا انتقال ۱۹ مارچ ۱۹۹۹ء کو لاہور میں ہوا۔

❋ ❋ ❋

عمیرہ عرفان

افسانہ "کھول دو" پر نوٹ

سعادت حسن منٹو ایک مشہور پاکستانی ادیب اور افسانہ نگار تھے۔ وہ ۱۹۱۲ء میں صوبہ پنجاب کے ضلع لدھیانہ کے قصبہ سمبرالہ میں پیدا ہوئے۔ منٹو کی ادبی زندگی کا آغاز لاہور سے ہوا۔ اس کے بعد وہ فلمی کہانیاں لکھنے بمبئی چلے گئے۔ انھوں نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی، ڈرامے، خاکے اور افسانے لکھے لیکن وہ صنف جس نے انہیں حیاتِ جاوداں بخشی وہ ان کی افسانہ نگاری ہے۔ وہ ایک سچّے اور بے باک فنکار تھے۔ ان کے فن کی انفرادیت یہ تھی کہ انھوں نے معمول میں بُرے سمجھے جانے والے کرداروں کے لیے انسان کے دل میں محبت اور احساس پیدا کیا۔ ان پر فحش نگاری کے الزامات بھی لگائے گئے حالاں کہ سچ تو یہ ہے کہ معاشرے کو ان کے افسانوں میں اپنا بدصورت اور کریہہ چہرہ نظر آتا ہے۔

"کھول دو" منٹو کی ایک کہانی ہے جس میں تقسیم ہند کے موقع پر خواتین پر کیے گئے مظالم کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار سراج الدین امرتسر سے ٹرین میں مغل پورہ پہنچے۔ ٹرین چڑھتے وقت تو ان کی بیٹی سکینہ ان کے ساتھ ہی موجود ہوتی ہے۔ مگر وہاں پہنچنے تک وہ کھو چکی ہوتی ہے۔ سراج الدین نے ذہن پر بہت زور ڈالا اور یاد کرنے کی کوشش کی کہ آخر وہ کب اور کہاں کھو گئی؟ کیا جب ٹرین رُکی تھی اور بلوائی اندر گھس آئے تھے، وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ کیا تب وہ اسے اغوا کر کے لے گئے۔ چند دنوں بعد جب سراج الدین کے حواس بحال ہوئے تو وہ ان لوگوں سے ملا جو اس کی مدد کر سکتے تھے۔ وہ مسلمان نوجوانوں کا ایک گروہ تھا جن کے پاس بندوقیں تھیں اور وہ گمشدہ خواتین اور بچوں کو پاکستان لانے کا کام کر رہے تھے۔ سراج الدین نے اپنی بیٹی کا حلیہ بتایا اور

انہیں لاکھ دعائیں دے کر بھیج دیا۔

کچھ دنوں بعد انہیں سکینہ ایک سڑک کنارے کھڑی دکھائی دیتی ہے۔ وہ اسے تسلّیاں دے کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ کئی دن گزر جاتے ہیں مگر سکینہ سراج الدین تک نہیں پہنچتی۔ پھر ایک دن کیمپ کے ہسپتال میں لڑکی کی ایک لاش آتی ہے۔ سراج الدین اسے پہچان لیتا ہے۔ ڈاکٹر لاش کے آپریشن کی وجہ سے اسے کھڑکی کھولنے کا کہتا ہے کہ سکینہ کے بے جان جسم میں جنبش ہوتی ہے اور وہ اپنی شلوار نیچے سرکاتی ہے۔ سراج الدین خوشی سے چلاتا ہے "میری بیٹی" زندہ ہے۔ حالاں کہ وہ ذہنی طور پر مر چکی ہوتی ہے۔

❋ ❋ ❋

زینب رشید

پنجابی فلم "انگر تیج" پر ریویو

کردار: انگر تیج، ماڑو، حاکم، دھن کور

انگر تیج اپنے دوست اسلم کے ساتھ میلہ میں جاتا ہے اور ماڑو، جس کو وہ پسند کرتا ہے، سے ملاقات کرتا ہے۔ اسی رات دونوں دوست ماڑو کے گھر جاتے ہیں اور انگر تیج، ماڑو کو بتاتا ہے کہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اور پھر اُس سے اگلے دن انگر تیج اپنے گھر والوں سے اسی بات کا ذکر کرتا ہے تو اس کی والدہ بہت شور مچاتی ہے لیکن اس کی بھابھی اس کی مدد کرنے کی حامی بھرتی ہے۔ پھر انگر تیج اور اسلم یہ بات ماڑو کو بتانے اس کے گھر جاتے ہیں۔ ملاقات کے دوران انگر تیج ماڑو کا ہاتھ پکڑنے لگتا ہے تو ماڑو کے باپو ان کو دیکھ کر آگے بڑھتے ہیں لیکن اسی وقت ان کو سانپ ڈس لیتا ہے جس کی وجہ سے ان کی زبان مفلوج ہو جاتی ہے۔

ایک دن ایک نوجوان کسی جگہ کا رستہ پوچھنے ماڑو کے گھر آتا ہے۔ حاکم نامی اس نوجوان کی نظر ماڑو پر پڑتی ہے اور وہ اسے پسند کرنے لگتا ہے۔ جب ماڑو گھر آئے اس مہمان کو لسّی کا گلاس پکڑا رہی ہوتی ہے تو وہ اسے چھُونے کی کوشش کرتا ہے۔ ماڑو کا باپ یہ دیکھ لیتا ہے مگر اپنی بیماری کی وجہ سے کچھ کہہ نہیں پاتا۔

حاکم بار بار کسی نہ کسی بہانے ماڑو کو ملنے آتا ہے اور دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگتے ہیں۔ اس دوران انگر تیج ماڑو کے خیالوں میں ہی گُم رہتا ہے مگر وہ اب اسے پسند نہیں کرتی۔ انگر تیج اپنی قیمتی بھینس بیچ کر ماڑو کے لیے سونے کا کنگن خریدتا ہے لیکن جب وہ اسے یہ تحفہ دینے کے لیے جاتا ہے تو وہ اس کی بات بھی نہیں سُنتی

اور اس کے پاس تھوڑا سا وقت گُزار کے واپس چلی جاتی ہے۔ اس کے برعکس حاکم اس کو ریڈیو لا کر دیتا ہے جو وہ خوشی سے لے لیتی ہے۔ اس ملاقات میں حاکم زبردستی ماڑو کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے جسے انگریج دیکھ لیتا ہے اور بہت دُکھی ہوتا ہے۔ اسلم اس کا دل بہلانے کی بہت کوشش کرتا ہے مگر ناکام رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اسلم ماڑو کا وہ ریڈیو چوری کر کے لاتا ہے اور اسے انگریج کے سامنے توڑ دیتا ہے مگر وہ پھر بھی دُکھی ہی رہتا ہے۔

پھر اس علاقہ میں ایک شادی ہوتی ہے جس پر انگریج، ماڑو اور حاکم اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ یہاں بھی ماڑو اور حاکم کی ایک دوسرے میں ہی دل چسپی دکھائی دیتی ہے اور یہ بات انگریج کا دل دُکھاتی رہتی ہے۔ اس سب کو دھن کور نامی ایک لڑکی دیکھتی ہے اور انگریج کی مددگار بن جاتی ہے۔ وہ مختلف طریقوں سے ماڑو پر اس بات کا اظہار کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ انگریج اور دھن کور ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ یہ دیکھ کر ماڑو کا دل جل اٹھتا ہے اور وہ پھر سے انگریج کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ دھن کور اور انگریج کا آخری منصوبہ ہوتا ہے کہ حاکم، دھن کور میں دل چسپی کا اظہار کرے گا اور ماڑو یہ دیکھ لے گی۔ جب ایسا ہوتا ہے تو ماڑو کا دل حاکم سے بالکل اُٹھ جاتا ہے۔ اسی رات حاکم دھن کور کو واقعی تنگ کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر انگریج اس کو روک دیتا ہے۔ ماڑو کا باپو انگریج کا یہ انداز دیکھ لیتا ہے۔ اس وقت تک دھن کور کو انگریج سے محبت ہو چکی ہوتی ہے۔

شادی کے بعد انگریج اپنے پہننے اوڑھنے میں تبدیلی لاتا ہے تو ماڑو اسے اور زیادہ پسند کرنے لگتی ہے۔ مگر وہ اب دھن کور سے محبت کرتا ہے۔ وہ بے چینی میں دوڑتا ہوا دھن کور کے گھر جاتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی شادی حاکم سے طے ہو چکی ہے۔ انگریج اس کے گھر والوں کو یہ بتانے کی کوشش کرتا ہے کہ حاکم اچھا آدمی نہیں ہے اور یہ کہ انگریج خود دھن کور سے محبت کرتا ہے تو وہ طیش میں آ کر اسے گولی مارنے لگتے ہیں لیکن ماڑو کا باپو عین اسی وقت وہاں پہنچ کر انگریج کے حق میں رائے کا اظہار کرتا ہے جس پر سب راضی ہو جاتے ہیں۔ اس

طرح انگریج اور دھن کور کی شادی ہو جاتی ہے۔

یہ کہانی انگریج نے اپنی زبانی سنائی ہوتی ہے جب وہ دھن کور کی راکھ لے کر بھارت سے پاکستان آیا ہوتا ہے کیوں کہ دھن کور نے مرنے سے پہلے اس خواہش کا اظہار کیا ہوتا ہے کہ اسے اس گھر لے جایا جائے جہاں وہ تقسیم پاک وہند سے پہلے رہا کرتی تھی۔

❋ ❋ ❋

نمود، شمارہ ۱۴، ۲۰۲۵ء

فاطمہ عمران

حاجرہ جبین

حارث سرور

صہیب افضل

سعادت حسن منٹو ''ٹھنڈا گوشت'' اور ''مقدمے'' کی داستان

تعارفی بیان

راوی: سعادت حسن منٹو اردو ادب کا وہ نڈر افسانہ نگار تھا جس نے سچائی سامنے لانے کے لیے ہر پابندی کا سامنا کیا۔ ۱۱ مئی ۱۹۱۲ء کو لدھیانہ (برطانوی ہندوستان) میں پیدا ہونے والے منٹو نے نوجوانی سے ہی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ بمبئی میں فلمی کہانیاں بھی لکھیں مگر اصل پہچان افسانوں سے بنی۔ اس کے کئی ابتدائی افسانے مثلاً ''کالی شلوار''، ''بو'' اور ''دھواں'' اپنے دور میں ''فحش'' قرار دیئے گئے اور منٹو کو عدالتوں کے چکر کاٹنے پڑے۔ لیکن منٹو اپنی بات کہنے سے باز نہ آیا۔

پھر ۱۹۴۷ء میں برصغیر کی تقسیم کا خونی سانحہ رونما ہوا، جس نے منٹو کو اندر تک ہلا کر رکھ دیا۔ انہی فسادات اور ہجرت کے تجربے نے منٹو سے اس کے بہترین افسانے لکھوائے۔ جیسے ''ٹوبہ ٹیک سنگھ''، ''کھول دو'' اور ''ٹھنڈا گوشت''۔ منٹو ۱۹۴۸ء میں ہجرت کر کے نئی مملکت پاکستان آ گیا۔ یہاں پہنچ کر بھی اس نے اتنی ہی بے باکی سے معاشرے کو آئینہ دکھانا جاری رکھا۔

۱۹۵۰ء کے آغاز میں لاہور کے ایک ادبی رسالے میں اس کا افسانہ ''ٹھنڈا گوشت'' شائع ہوا۔ اس کہانی

میں منٹو نے تقسیم کے دوران ہونے والے فساد اور درندگی کا ایک لرزہ خیز واقعہ بیان کیا: ایک سکھ کردار ایشور سنگھ بلوے میں قتل و غارت اور لوٹ مار کرنے کے بعد ایک نوجوان لڑکی کو اغوا کرتا ہے اور اس کی عصمت دری کی کوشش کرتا ہے۔ مگر اس دوران اس پر یہ بھیانک انکشاف ہوتا ہے کہ لڑکی پہلے ہی مر چکی تھی۔ ''ٹھنڈا گوشت'' لاش۔ اس صدمے نے ایشور سنگھ کو نامرد کر دیا تھا۔ کہانی کا یہ موضوع اور اس میں کلونت کور کے جسمانی خدّوخال کی بے باک عکاسی نے بہت سے لوگوں کو ہلا کر رکھ دیا۔

اس افسانے کی اشاعت پر شدید رَدِّ عمل ہوا۔ بتایا جاتا ہے کہ رسالہ ''جاوید'' کے دفتر پر حُکام نے چھاپہ مارا اور ''ٹھنڈا گوشت'' کی تمام کاپیاں ضبط کر لیں۔ اخلاقی قدروں کے خود ساختہ محافظ اسے ادب نہیں بلکہ فحاشی قرار دینے لگے۔ بالآخر یہ معاملہ عدالت تک پہنچا۔ ۱۹۴۹ء میں منٹو پر حکومت نے تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۲۹۲ کے تحت فحش لٹریچر شائع کرنے کا فوجداری مقدمہ دائر کر دیا۔ یہ مقدمہ تقریباً تین سال تک چلتا رہا اور اس نے منٹو کی زندگی کو ایک نئی آزمائش میں ڈال دیا۔

اس عدالت میں ایک طرف منٹو قلم کی آزادی کا دفاع کر رہا تھا تو دوسری جانب ریاست اسے ''سبق'' سکھانے پر تُلی تھی۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ اس تاریخی مقدمے میں کیا ہوا۔

کمرہ عدالت کا منظر

منظر اوّل: مقدمے کا آغاز

راوی: (عدالت کا کمرہ۔ سال ۱۹۴۹ء، لاہور کی ایک عدالت۔ جج اپنی کرسی پر متمکن ہے۔ منٹو ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا ہے۔ سرکاری وکیل استغاثہ اور کچھ تماشائی موجود ہیں۔)

جج: (ہتھوڑی کی آواز کے ساتھ) کیس شروع کیا جاتا ہے۔ ریاست بنام سعادت حسن منٹو۔

استغاثہ: جناب عالی! ملزم پر الزام ہے کہ اس نے ایک فحش افسانہ بعنوان ''ٹھنڈا گوشت'' تحریر کیا اور شائع

کروایا، جو تعزیرات پاکستان دفعہ ۲۹۲ کے تحت قابل سزا جرم ہے۔

جج: (منٹو سے) منٹو صاحب، آپ نے استغاثہ کا الزام سُن لیا۔ کیا آپ الزام قبول کرتے ہیں؟

منٹو: ہر گز نہیں حضور! میں نے کوئی جُرم نہیں کیا۔ میں نے تو صاف ایک کہانی لکھی ہے۔

استغاثہ: صرف کہانی؟ ایسی کہانی جس نے پورے معاشرے میں ہلچل مچا دی! ایسی عریاں داستان جس سے نوجوانوں کے اخلاق بگڑنے کا خطرہ ہے جناب۔

جج: (سخت لہجے میں) منٹو صاحب، سنجیدگی سے جواب دیں۔ آپ ایک سنگین الزام کا سامنا کر رہے ہیں۔

جج: (استغاثہ کی طرف دیکھ کر) وکیل صاحب، اپنے دلائل پیش کریں اور عدالت کو بتائیں کہ آپ کے مؤقف کے مطابق یہ افسانہ کیوں فحش ہے۔

استغاثہ: شکریہ حضور! (افسانے کی کتاب ہاتھ میں اٹھائے ہوئے) یہ ہے وہ مذموم افسانہ "ٹھنڈا گوشت" میں اس کے چند اقتباسات عدالت کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ فحاشی واضح ہو جائے۔ اجازت ہو تو شروع کروں؟

جج: اجازت ہے۔

استغاثہ: (افسانہ زور سے پڑھتے ہوئے) کلونت کور پلنگ پر نیم دراز تھی۔ اس کا دوپٹہ سینے سے سرک کر اس کے گلے میں لٹک رہا تھا اور....." (وہ اچانک رک کر کتاب بند کر دیتا ہے) بس جناب، آگے کے الفاظ زبان پر لانا میرے لیے ممکن نہیں! یہ نہایت فحش مناظر ہیں..... پوری کہانی اسی قسم کی عریانیت سے بھری پڑی ہے۔

جج: (ابرو چڑھا کر) تو کہانی میں جنسی مناظر کی عکاسی ہے؟

استغاثہ: جی بالکل! اور انتہائی بے شرمی کے ساتھ مصنف نے ذرا بھی حیا سے کام نہیں لیا۔ عدالت ملاحظہ کرے

کہ یہ کس طرح ایک عورت کے جسمانی اعضا کا ذکر کر رہا ہے..... یہ کھلی فحاشی نہیں تو اور کیا ہے!

جج: (منٹو کی طرف دیکھتے ہوئے) منٹو صاحب، آپ اس بارے میں کیا کہنا چاہیں گے؟

منٹو: (ہلکی مکراہٹ کے ساتھ) حضور، اگر عورت کے سینے کو سینہ نہ لکھتا تو کیا اسے "مونگ پھلی" لکھ دیتا؟

جج: (کڑک کر) منٹو صاحب، یہ عدالت ہے، تماشا نہیں! الفاظ کے استعمال میں محتاط رہیے۔

استغاثہ: دیکھیے حضور، ملزم کو اپنے لکھے پر کوئی ندامت نہیں۔ اُلٹا یہ عدالت کو چیلنج کر رہا ہے!

منٹو: ندامت کس بات کی جناب؟ میں اپنے افسانے کو ادب سمجھتا ہوں، کوئی گناہ نہیں۔

جج: (ہتھوڑی کی آواز) عدالت کی کارروائی کل تک ملتوی کی جاتی ہے۔ تمام لوگ کل کی سماعت تک کے لیے تشریف لے جاسکتے ہیں۔

منظر دوم: جرح و بحث

راوی: (اگلے دن کا منظر۔ عدالت کی کارروائی دوبارہ شروع ہوتی ہے۔ لوگ کیس کی سنسنی خیزی کے باعث عدالت میں بڑی تعداد میں موجود ہیں۔)

جج: جی وکیل صاحب، آج اپنے گواہان یا مزید دلائل پیش کیجیے۔

استغاثہ: شکریہ جناب۔ (منٹو کی جانب مڑ کر) منٹو صاحب، مجھے چند سوالات کے جواب چاہئیں۔ یہ بتائیں کہ آپ نے ایسی گھناؤنی کہانی لکھنے کی ضرورت کیوں محسوس کی؟ ایک مرچکی لڑکی کے ساتھ..... (کھنکار کر) ایسے واقعے کو افسانہ بنانے کا کیا مقصد تھا آپ کا؟ آپ کیا ثابت کرنا چاہتے تھے اس سے؟

منٹو: (سنجیدہ لہجے میں) میں نے وہی دکھایا جو فساد کے دوران حقیقت میں ہوا تھا۔ ہمارا معاشرہ اس وقت ایسے حالات سے گُزر رہا تھا جس نے انسانوں کو حیوان بنا دیا تھا۔ میں نے وہی حقیقت قلم بند کی ہے۔

استغاثہ: مگر ایک گندی حقیقت دکھا کر آپ معاشرے کی کیا خدمت کر رہے تھے؟ آپ کے افسانے میں تو کوئی

اخلاقی سبق نہیں، صرف خون اور شہوت کا تماشہ ہے!

منٹو: جناب والا، اخلاقی سبق موجود ہے۔ اس کہانی سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جب انسان حیوان بن جائے تب بھی اس کے اندر کا انسان کسی نہ کسی شکل میں زندہ رہتا ہے اور اسے ملامت کرتا ہے۔ ایشور سنگھ آخر میں اعتراف کرتا ہے کہ اس سے گھناؤنا جرم سرزد ہوا ہے۔ میری تحریر کا مقصد قاری کو لرزانا تھا تاکہ وہ سوچے۔ کہیں بھی میں نے جنسی تعلق کو لذت یا شہوانی تسکین کے لیے پیش نہیں کیا؟ میں نے صرف معاشرے کی بھیانک سچائی دکھائی ہے تاکہ لوگ اس سے سبق سیکھیں۔

استغاثہ: (طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے) سبق؟ حضور، عام لوگ اس افسانے سے سبق کم اور گندی سنسنی زیادہ لیں گے! نوجوان قارئین ایسی کہانیاں پڑھ کر صرف ہیجان محسوس کریں گے۔ اس قسم کا ادب پھیلا تو انارکی پھیل جائے گی!

منٹو: آپ میرے قاری کو اتنا کمتر کیوں سمجھتے ہیں صاحب؟ اور ان فسادات کی حقیقت سے مُنہ موڑ کر کیا ہم انہیں ختم کر سکتے ہیں؟ جناب عالی، اگر سماج میں گندگی ہے تو اس کی عکاسی کرنا فحاشی نہیں۔ اگر میرے افسانے آپ کو ناگوار گزرتے ہیں تو اس کا مطلب ہے معاشرہ خود ناقابلِ برداشت حالت میں ہے۔ برائی میری تحریر میں نہیں، برائی ان حالات میں ہے جنہیں میں نے قلم بند کیا۔

استغاثہ: (تیوری چڑھا کر) حضور، میں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ اس افسانے میں ایک سکھ کو ایک مسلمان لڑکی کے ساتھ ظلم کرتے دکھایا گیا ہے۔ یہ بہت حساس معاملہ ہے۔ نئے بننے والے ملک میں ایسے افسانے فرقہ وارانہ جذبات کو بھڑکا سکتے تھے۔ مصنف نے ذرا ذمہ داری نہیں دکھائی اپنے قلم کے ذریعے۔

منٹو: جناب، فسادات میں جو ہوا وہ میں نے لکھ دیا۔ اگر ایک سکھ کے ہاتھوں یہ ظلم ہوا تو کیا میں اسے کسی اور مذہب کا بتا کر جھوٹ لکھتا؟ میرا کام سچ دکھانا ہے، حالات جیسے بھی ہوں۔ میں کسی کی خوشامد کے لیے

حقیقت نہیں بدل سکتا۔

جج: (ہاتھ اٹھا کر دونوں کو خاموش کرواتے ہوئے) بس، عدالت مقدمے کے تمام پہلو سُن چکی ہے۔ دونوں فریقین کے دلائل اور مؤقف سامنے آ چکے ہیں۔ عدالت کچھ دیر وقفہ کر کے فیصلہ سنائے گی۔ (ہال میں سرگوشیاں شروع ہوتی ہیں۔)

منظر سوم: فیصلہ

راوی: (تھوڑی دیر بعد جج دوبارہ کمرہ عدالت میں آتا ہے۔ سب خاموش ہو کر فیصلے کے انتظار میں ہیں۔)

جج: (فائل سے فیصلہ پڑھتے ہوئے) عدالت اپنا فیصلہ سنانے لگی ہے، براہ مہربانی خاموشی قائم رکھیں۔ تفصیلی غور و خوض اور افسانہ ''ٹھنڈا گوشت'' کے محتاط مطالعے کے بعد عدالت اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ یہ افسانہ مجموعی طور پر فحش اور اخلاق باختہ مواد پر مبنی ہے۔ کہانی میں ایسے جنسی اور پر تشدد مناظر ہیں جو عام قارئین کے اخلاق پر منفی اثر ڈال سکتے ہیں۔ لہٰذا ملزم سعادت حسن منٹو کو فحش لٹریچر کی اشاعت کے جرم میں قصوروار ٹھہرایا جاتا ہے۔

جج: سزا کے طور پر عدالت تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۲۹۲ کے تحت ملزم کو تین ماہ قید بامشقت کی سزا سناتی ہے اور تین سو روپے جرمانہ عائد کرتی ہے۔ عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں ملزم کو مزید اکیس روز قید بھگتنا ہو گی۔

جج: (ہتھوڑی کی آواز) عدالت برخاست کی جاتی ہے۔

راوی: (کمرے میں ہلچل مچ جاتی ہے۔ کئی لوگ فیصلے پر چہ مگوئیاں کر رہے ہیں۔ منٹو خاموش کھڑا رہتا ہے۔ پولیس اہلکار آ کر اس کی ہتھکڑی کھول دیتے ہیں کیوں کہ اس نے جرمانہ موقع پر ہی ادا کر دیا تھا۔ منٹو کمرہ عدالت سے باہر نکلتے ہوئے ایک پل کو مُڑ کر کٹہرے کو دیکھتا ہے اور گہرا سانس لیتا ہے۔ اس کی آنکھوں

میں عجیب سی چمک ہے۔)

راوی: منٹو اس فیصلے کے خلاف فوراً اعلیٰ عدالت میں اپیل دائر کرتا ہے۔

منظر چہارم: اپیل اور آخری فیصلہ

راوی: (۱۹۵۰ء کی ایک دوپہر، لاہور کی سیشن عدالت کا منظر۔) چند ماہ بعد منٹو کی اپیل کی سماعت سیشن عدالت میں ہوتی ہے۔ سیشن جج عنایت اللہ خاں مجسٹریٹ کے فیصلے پر نظر ثانی کے بعد آج اپنا فیصلہ سنانے والے ہیں۔ کمرہ عدالت میں پھر سے بھیڑ ہے اور سب کو فیصلے کا انتظار ہے۔

جج: سیشن عدالت تمام دلائل دوبارہ سُن چکی ہے اور کیس کا از سر نو جائزہ لیا گیا ہے۔ اب ہم اپیل کا فیصلہ سنائیں گے۔

جج: پچھلی عدالت کے فیصلے پر نظر ثانی کے بعد، یہ عدالت اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ افسانہ ''ٹھنڈا گوشت'' فحاشی کے قانونی معیار پر پورا نہیں اُترتا۔ ممکن ہے کہ کہانی کا موضوع بعض لوگوں کو ناگوار گزرا ہو یا کسی کی شخصی رائے میں یہ ادب کا اچھا نمونہ نہ ہو، مگر قانون کی نظر میں یہ تحریر فحش نہیں ہے۔ اس میں عریانی و شہوت انگیزی بطور تفریح یا ترغیب پیش نہیں کی گئی۔

جج: لہٰذا سیشن عدالت مجسٹریٹ کے فیصلے کو کالعدم قرار دیتے ہوئے ملزم سعادت حسن منٹو کو فحاشی کے الزام سے باعزت بری کرتی ہے۔ پہلے جو قید و جرمانہ کی سزا سنائی گئی تھی وہ منسوخ کی جاتی ہے۔ اگر ملزم نے جرمانہ ادا کر دیا ہے تو وہ رقم اسے واپس کی جائے۔

جج: (مسکراتے ہوئے ہتھوڑی بجاتا ہے) کیس ختم کیا جاتا ہے۔

راوی: (عدالت میں تالیاں بجنے لگتی ہیں۔ منٹو کے چہرے پر مُسکراہٹ آ جاتی ہے۔ وہ اپنے وکیل یا ساتھی سے مصافحہ کرتا ہے اور کمرہ عدالت سے باہر نکل جاتا ہے۔ یہ مقدمہ اختتام پذیر ہوتا ہے۔)

انٹرویو: ماہرِ ادب سے گفتگو

میزبان: ناظرین! اب ہم اردو ادب کے ایک ماہر سے بات چیت کریں گے تاکہ منٹو کے فن اور ان کے متنازعہ افسانے ''ٹھنڈا گوشت'' کی اہمیت پر روشنی ڈالی جا سکے۔ ہمارے ساتھ موجود ہیں پروفیسر جمیل احمد، جو اردو ادب کے ممتاز نقاد ہیں۔ پروفیسر صاحب، بہت شکریہ آپ نے اپنا قیمتی وقت دیا۔

میزبان: پہلا سوال میرا آپ سے یہ ہے کہ منٹو کو اپنے زمانے میں اتنا متنازعہ کیوں سمجھا جاتا تھا؟ ان کے افسانوں میں ایسی کیا بات تھی جو لوگوں کو ناگوار گزرتی تھی؟

میزبان: خاص طور پر ''ٹھنڈا گوشت'' کی بات کریں گے۔ اس افسانے میں ایسی کیا بات تھی جس پر اتنا ہنگامہ ہوا اور مقدمہ قائم کرنا پڑا؟

میزبان: جب یہ مقدمہ چلا تو منٹو نے اپنی صفائی میں کیا مؤقف اختیار کیا؟ انھوں نے عدالت کو کیا کہا اور آپ اس بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟

میزبان: اس مقدمے کا اثر اردو ادب پر یا لکھاریوں پر کیا پڑا؟ کیا اس واقعے کے بعد آزادیِ اظہار پر کوئی بحث چھڑی اور آئندہ کے لیے کچھ بدلاؤ آیا؟

میزبان: آج کے دور میں سعادت حسن منٹو کو کس نظر سے دیکھا جاتا ہے؟ ان کی میراث (legacy) کے بارے میں کیا کہیں گے؟

میزبان: کیا وقت کے ساتھ ساتھ لوگوں کا منٹو کی تحریروں کے بارے میں رویہ بدل گیا ہے؟ جو کل انہیں بُرا کہہ رہے تھے کیا آج وہی انہیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں؟

میزبان: آخری سوال: آپ کے خیال میں جو سچ منٹو نے اس دور میں لکھا تھا، کیا ویسا سچ آج کے لکھاری آسانی سے لکھ سکتے ہیں؟ یا آج بھی ہمیں ویسی ہی سنسر شپ اور رکاوٹوں کا سامنا ہے؟

میزبان: بہت شکریہ پروفیسر صاحب، آپ نے واقعی بہت اہم نکات ہمارے ساتھ شیئر کیے۔

اختتامی کلمات

راوی: سعادت حسن منٹو نے اپنی مختصر زندگی (صرف ۴۲ برس کی عمر) میں اردو ادب کو نئے راستے دکھائے۔ ۱۸ جنوری ۱۹۵۵ء کو وہ صرف بیالیس سال کی عمر میں دنیا سے رُخصت ہو گیا مگر اپنے پیچھے کہانیوں کا ایک ایسا خزانہ چھوڑ گیا جو آج بھی زندہ ہیں۔ منٹو کے افسانے آج بھی ہمیں جھنجھوڑتے ہیں، ہمارے معاشرے کے تاریک گوشوں سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ وہ خود کہتا تھا: ''اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب ہے کہ یہ زمانہ ناقابلِ برداشت ہے۔'' یہ بات آج بھی ہمارے لیے اتنی ہی اہم ہے۔

منٹو کی لڑائی اس کے لفظوں کے ذریعے جاری رہی اور اس کی تحریریں ہمیں جرأت اور سچائی کا درس دے گئی ہیں۔ اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم اس سچ کا کیسے سامنا کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم آج وہ حقیقت برداشت کر سکتے ہیں جو منٹو نے ستر سال پہلے بے خوف و خطر بیان کر دی تھی؟ منٹو کا قلم ہم سے آج بھی یہی سوال پوچھ رہا ہے۔

❋ ❋ ❋

پنجابی

علی مرتضیٰ بلوچ

بابا بلھے شاہؒ

بابا بلھے شاہؒ داشمار اٹھارھویں صدی دے پنجابی زبان دے مشہور شاعراں وچ ہوندا اے۔ ایہناں دی شاعری نوں فکر دی گہرائی، فلسفیانہ بصیرت تے صوفیانہ حوالیوں وڈے پیمانے تے سیانیا جاندا اے۔ اوہناں دی شخصیت وی اوہناں دی شاعری دی طرح وڈی سی، ایس وجہ توں ایہناں داشمار پنجابی ادب دی عظیم شخصیات دی فہرست وچ ہوندا اے۔

بابا بلھے شاہؒ دی پیدائش موجودہ پاکستان دے صوبے پنجاب دے شہر قصور وچ ۱۶۸۰ء وچ ہوئی۔ اوہناں دے والد شاہ محمد درویش اک معروف صوفی بزرگ سن۔ بلھے شاہ دی پرورش روحانیت تے مذہبی تعلیم توں بھرپور ماحول وچ ہوئی۔ پر ایہہ روایتی مذہبی نظام توں مایوس تھی گئے تے ایس دی جگہ مشہور صوفی بزرگ حضرت شاہ عنایت قادریؒ دی تعلیمات دی طرف متوجہ ہو گئے۔ ایس نسبت نال ایہناں دا تعلق صوفیاء دے قادریہ مکتبہ فکر نال سی تے ایس توں اڈ، اوہناں دی ذہنی نشوونما دے وچ قادریہ توں اڈ شطاریہ فکر داوی نمایاں کردار اے۔ ایہی وجہ اے پئی اوہناں دی شاعری دے باغیانہ فکر دی بنیاد شطاریاں نال ملدی اے۔ بلھے شاہؒ نے اپنی روحانی جدوجہد دی بدولت برصغیر پاک وہند دے مختلف علاقیاں دا سفر کیتا تے ایس سفر دے ذریعے ایہناں نوں شیخ صدرالدین عارف تے شاہ عبداللطیف کاظمی سمیت کئی صوفی اساتذہ دی تعلیمات توں فیض حاصل کرن داشرف حاصل ہویا۔

بابا بلھے شاہ دی شاعری دا سب توں مشہور مجموعہ اوہناں دیاں کافیاں نیں جیہڑیاں پنجابی زبان وچ لکھی

گئی ۱۰۰ توں ودھ نظماں دا مجموعہ اے۔ کافی پنجابی ادب دا اک خوبصورت شاہکار اے جیہنوں اوہدی خوبصورتی تے بصیرت لئی وڈے پیمانے تے پڑھایا تے پڑھیا جاندا اے۔ کافی دے وچ بہت ساریاں سُراں موسیقی دے طور تے رکھیاں گئیاں نے جیہناں نوں اج وی محفلاں تے تہواراں وچ پیش کیتا جاندا اے۔ بلھے شاہؒ دی اک مشہور کافی ''ہن میں لکھیا سوہنا یار'' دے کجھ مصرعے ویکھو:

جدوں اک اکلا سی، نہ ظاہر کوئی تجلّی سی
نہ رب رسول نہ اللہ سی نہ سی جبار تے قہار
بے چون و بے چگونہ سی بے شبہ تے بے نمونہ سی
نہ کوئی رنگ نہ نمونہ سی، ہن ہویا گونا گون ہزار

بلھے شاہ دی شاعری اپنی روحانی تے فلسفیانہ گہرائی دے نال نال غربت، عدم مساوات تے جبر جیہے سماجی مسئلیاں دے اتے تبصرہ کرن لئی مشہور اے۔ خاص طور تے ایہناں دا جنگ دے حوالیوں کیتا گیا ادبی کم شاعری دا اک اہم مجموعہ اے جیہڑا تشدّد تے عسکریت پسندی اپر تنقید کردا اے۔ اپنیاں کئی کافیاں وچ بلھے شاہؒ نے جنگ دے نال ہون والیاں تباہیاں تے تشدّد دی سخت ممانعت کیتی اے۔ جنگ دے ہولناک واقعات نوں بیان کرن لئی اوہناں نے بھرویں تصویر کشی کیتی اے، جیہدے وچ شہریاں تے فوجیاں دے اتے آن والیاں مصیبتاں نوں یکساں طور تے وکھایا گیا اے۔ اپنی مشہور کافی ''تیرے عشق نچایا'' وچ بلھے شاہؒ نے محبوب نال عشق دا بھرواں اظہار کیتا اے۔

ایتھے بلھے شاہؒ ایس گل دا اظہار کر رہے نیں کہ جنگ دی اصل جان و مال دے نقصان توں اڈ انسانی رشتیاں دی تباہی تے سماجی بندھناں دا ٹٹناوی اے۔ بلھے شاہؒ ایس گل تے وی روشنی پا رہے نیں جو جنگ زندگی دے ساریاں شعبیاں توں تعلق رکھن والے لوکاں نوں اثر انداز کر دی اے۔

جنگ تے تنقید کرن دے نال نال بلھے شاہؒ صرف تشدد تے تنازعات دی مذمت نہیں کر دے۔ ایس

دی بجائے اوہ جنگ دے بارے وچ اِک نفیس تے پیچیدہ نظریہ پیش کر دے نیں۔ جیہڑا اوہناں جذبیاں نوں تسلیم کر دا اے جو لوکاں نوں لڑن تے مجبور کر دے نیں۔ مثال دے طور تے بلھے شاہؒ اپنی کافی ''چل بلھیا اوتھے چلیے'' وچ لکھدے نیں:

چل بلھیا چل اوتھے چلیے
جتھے سارے انّھے
نہ کوئی ساڈی ذات پچھانے
نہ کوئی سانوں منّے

ایہہ اک تصوّر اے ہے کہ ساڈی اکھاں اس کائنات دے وچ موجود ہر شے نوں کثیر تعداد وچ ویکھدیاں نیں، ایہہ انسان، حیوان، چاند، سورج، تارے، ایہہ میں، ایہہ توں تے ایس تو علاوہ ساڈے مفادات وی اک دوجے نال متصادم نیں، لیکن اک گہری نظر رکھن والے اشیاء دی کثرت نوں اک سطحی مظہر سمجھدے نیں تے کل وجود نوں اک وحدت ویکھدے نیں''

انج دے صاحبِ نظر لوک بہت گھٹ نیں تے زیادہ تر لوکاں لئی اک لمبی تربیت درکار ہوندی اے۔ تاجوں اوہ چیزاں دی کثرت نوں اک وحدت دے وچ ویکھن۔ جے تے انسان ایس مقام تائیں پہنچنا چاندا اے تے اوہنوں جاپدا اے کہ سب توں پہلے اوہ اپنی انا ختم کرے تے انانوں ختم کرن دا سب تو بہتر تے موثر ذریعہ عشق اے۔

بلھے شاہ دی شاعری پنجابی شاعراں تے موسیقاراں لئی تحریک دا ذریعہ اے تے اوہناں دی میراث اج وی زندہ اے۔ ایہناں دی شاعری دا ترجمہ انگریزی، ہندی، اردو تے فارسی سمیت کئی زباناں وچ کیتا گیا اے۔ ایہناں دی شاعری نے ساری دنیا دے لوکاں نوں متاثر کیتا اے۔ پنجابی ادب راہیں روحانیت پھیلاون وچ اوہناں نے بڑا اہم کردار ادا کیتا اے، تے اوہناں دی ایہہ شعری میراث فن تے انسانی روح دی پائیداری دا ثبوت اے۔

❋ ❋ ❋

طلحہ حسنین

مواعظِ نوشہ دا تجزیہ

مواعظ دا مطلب نصیحت کرنا اے۔ پنجابی وچ ایس نوں تبلیغات دے مطلب وچ کہی دا اے۔ ایہنوں سندھی وچ وعظ کہیدا اے تے پنجابی وچ ''سکھاوا'' مواعظ وکھرے لوکاں نوں ایمان، اخلاص، خدمت گزاری تے نیک رویاں دے بارے وچ سمجھاون لئی دتے جاندے نیں۔

مواعظ اک بہت خوب صورت طریقہ اے، جدوں کوئی شخص دوجے شخص نوں کوئی ہدایت دینا چاہندا اے۔ مواعظ دیاں بے شمار شکلاں نیں جیویں کتاباں، تقریراں، سُنے جان والے قصے یا خطاباں دوارے دتے جاندے نیں۔ مواعظ مختلف موضوعات تے بولے جاندے نیں جیویں نیک کاری، روشن خیالی، اچھے اخلاق، محبت، سماجی نصیحت، اسلامی تعلیمات تے دوسرے فرائض۔

مواعظ اک عمدگی رکھن والا مضمون اے۔ جیہنوں لوکاں دی زندگی نوں سدا بہتر بنان دے لئی ورتیا جاندا اے۔ ایہدے وچ بہت سارے نکات ہوندے نیں۔ جیویں کہ دین دی تعلیم، اخلاق دی بہتری تے زندگی دا مقصد۔

مواعظ عام طور تے قرآن پاک توں اقتباسات ہوندے نیں۔ مزید اسلامی تاریخ تے سنت دی گل ہوندی اے۔ پنجابی وچ بے شمار مواعظ موجود نیں۔ سید شریف احمد شرافت نوشاہی اپنی کتاب مواعظ نوشہ پیر وچ نوشہ گنج بخش دے لکھے گئے مواعظ نوں نقل کر کے بہت عمدہ طریقے نال پیش کر دے نیں۔ شرافت نوشاہی حضرت نوشہ دی اولاد وچوں نیں تے اوہناں ''پنجاب یونیورسٹی لائبریری'' دیاں قلمی کتاباں وچوں

حضور دے چار وعظ جمع کر کے مرتب کیتے نیں۔ جو علم دا نادر نمونہ نیں۔

شرافت نوشاہی علمی مرکز لاہور توں دور ہو کے وی نہایت اعلیٰ تحقیقی تے علمی خدمات نوں سر انجام دیندے رہے۔ جو اج وی اپنی مثال آپ نیں۔ ایہناں نے اپنی ستونجوں (۵۷) سالہ تصنیفی زندگی وچ ۲۱۲ دو سو بارہ کتاباں تصنیف و تالیف، مرتب تے ترجمہ کیتیاں نیں۔ ایہناں دے والد دا اسم گرامی اعلیٰ حضرت مولانا سیّد غلام مصطفیٰ نوشاہی اے۔ ایہناں دا شجرہ نسب نو واسطیاں توں امام سلسلہ نوشاہیہ حضرت نوشہ گنج بخش نال جا ملدا اے۔

نوشوہ گنج ہوراں دا نکاح ۱۳۴۲ھ وچ مستونہ ہویا۔ ایہناں دے دو صاحبزادے تے تن صاحبزادیاں نیں۔ ایہناں دی زندگی دے دو اہم پہلو سن۔ اک روحانی تے دوجا علمی۔ ہن ایہناں دیاں تصانیف ویکھدے آں۔

تفسیر: وارلیتیم فی فضائل بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم (عربی علوم القرآن)

حدیث: الروض الجنان فی احادیث سید الانس والجان۔

فقر: i-انوار السیادت فی آثار السعادت

ii-تحفۃ المبین فی جواز سماع العاشقین

iii-سیادت العلویہ

iv-صحیفہ مسائل

v-نقش بندیوں میں سجدہ تعظیم

vi-وعظ نوشاہی

ایس توں اڈ ایہناں نے مناظرہ، تصوف، تاریخ، تذکرہ، فضائل، نسب نامے، شجرے، مراجع، مکاتیب،

روزنامچے، سفر نامے، اوراد، عملیات، ادب، تحقیق و تنقید، طب، خواب نامے، بیاضیں، متفرقات، علوم قرآنی، فقہ، تاریخ، تذکرہ، تصوف، مکاتیب، سفر نامے، نسب نامے، شجرے تے اورادو عملیات تے بے شمار کتاباں لکھیاں سن۔

نوشہ گنج بخش دا اصل ناں حاجی محمد اے۔ تے نوشہ تخلّص اے تے گنج بخش ایہناں دالقب یا خطاب اے۔ اوہ ۱۰۱۴ھ / ۱۶۰۲ء وچ موضع گگا، نواحی تحصیل پھالیہ ضلع گجرات وچ پیدا ہوئے۔ ایہناں نے اپنی زندگی خدا دے راہ وچ وقف کیتی ہوئی سی۔ کوئی ایہناں دے دروازے تے آیا خالی نہیں گیا۔ ایہناں نے پنجابی زبان وچ نظم تے نثر وچ اپنی تبلیغ نوں جاری رکھیا۔ ایہناں دی تبلیغ نال دو لکھ غیر مسلم اسلام دے حلقے وچ آئے۔ ایہناں دا کلام تصوف تے توحید توں اڈ ادب دے وچ سند منیا جاندا اے۔

ایہناں دا پنجابی کلام دوواں طرحاں دا پایا جاندا اے۔ نظم وی تے نثر وی۔ نظم تے ہزاراں دی تعداد وچ شعر موجود نیں۔ نثر وچ ایہناں دے چار وعظ ہتھ لگے نیں جو ٹھیٹھ پنجابی دے علاقے باردی زبان وچ لکھے ہوئے نیں۔ وعظ تقریباً ۹۹۰ھ دے وچ لکھے گئے نیں۔ پہلی وجہ ایہہ اے جے ۹۸۸ھ وچ حضرت نوشہ صاحب نے حضرت سخی بادشاہ دے ہتھ تے بیعت کیتی سی تے اوسے سال ہی خلافت ارشاد توں مشرف ہوئے سن۔

دوجی وجہ ایہہ اے پئی ایہناں نے اپنیاں چوہاں وعظاں وچ تصوّف تے توحید دے گہرے مسائل تے ڈونگھے حقائق نوں نہیں چھیڑیا۔ جتھوں ایہہ پتہ چلدا اے جے ایہہ وعظ ایہناں دے ابتدائی زمانہ دے ای ہو سکدے نیں۔

ایہناں دا ایہہ طریقہ سی جے اللہ نوں ''سائیں'' دے لفظ نال یاد کردے سن، صوفیاں، حق دیاں طالباں نوں ''سائیں والے'' یا ''سائیں لوک'' یا ''سچے'' آکھدے سن۔ ایہناں وعظاں توں ایہہ وی پتہ چلدا اے جو آپ اپنی تقریر وچ خدا توں ڈردے تے اللہ والیاں دی تابعداری کرنے تے پرہیز گاری اختیار کرنے تے دل

نوں صاف کرن دیاں نصیحتاں کر دے سن۔

ایہناں دے وعظ نصیحت داڈھنگ زبانی تے لکھ کے دوواں طرحاں سی لکھ کے وعظ کر دیاں ہویاں اوہناں اپنی مادری زبان تے پنڈ دی زبان کولوں کم لیا۔ تاں جے لوک ایہناں دیاں گلاں چنگی طرح سمجھ لین۔ حق داراہ ٹھوک وجاکے پاناں چاہیدا اے۔ حضرت نوشہ دے بھاگ اللہ سائیں نے کڈے سچے تے سوہنے لکھے سن۔ جے ایہہ وعظ نصیحت تے ہدایت وکھان دا کم اوہناں دی ٹابری وچ ہن توڑی پایا جاندا اے۔

ایہناں دے وعظاں نوں دوہیں پاسیوں ویکھن دی لوڑ اے۔ معنیاں ولوں وی تے بولی پاروں وی۔ معنیاں دے لحاظ نال ایہہ چار وعظ اسلامی شرع دی پوری پوری شرح کر دے نیں۔

زبان ولوں ایہہ چھوٹی جیہی کتابڑی، جیہڑی عزت شان ولوں وڈیاں وڈیاں کتاباں توں بھاری اے۔ اوس ویلے ٹھیٹھ بولی وچ لکھی گئی۔

حضرت نوشہ دے وعظاں داناں سید شریف احمد تے ''مواعظ نوشہ پیر'' رکھیا اے۔

پہلا وعظ

بابا! سائیاں والے فرمایا ہے جو سائیں خود مختار
ہے جو مندا ہیں سو ہیں اوہ جیویں رکھے تیویں رہیے
اوس تے کسے دا حکم ناہیں اوہ سب دا حاکم ہے کون سائیں
نوں آکھے اینویں نہیں تے اینویں کر

بابا! سائیں لوک سائیں دے مناون بھلیائی دے کراون آؤندے ہین ایہناں نوں ہور کسے کم دی غرض ناہیں۔ جو آکھن قیامت کدوں ہوسی۔ جدوں ہوسی تدوں ہوسی تساں چنگیائی کروتے سائیں تھوں ڈرو کلمہ سچ دا بھرو۔

ایس وعظ وچ اوہ اللہ نوں سائیں آکھ رہے نیں۔ آکھدے نیں سائیں خود مختار اے۔ اس تے کسی دا

کوئی حکم نہیں۔ جو سائیں کہے اوہ ای سب ہے سب کم سائیں دا اے۔ سائیں نوں کوئی کجھ نہیں کہہ سکدا۔ سائیں نوں منن والے نوں کسی دی غرض نہیں۔ جو آکھوں قیامت کدوں تے کہے جدوں ہووے اودوں ای ہے تُسی نیکی کرو سائیں توں ڈرو۔ اوس دا کلمہ پڑھو۔ فیر کہندے نیں:

بابا! ہک پھوکا اسرافیل دا بناوٹ دے
ڈھا ہن ولا جیوندیاں دا مارن والا ہے تے
دووا پھوکا ڈھٹھے اُسارن والا تے موئے جواون والا ہے

ایس دا اک اک لفظ دل دیاں ڈونگھیائیاں دے وچ بہہ جاندا اے۔ حضرت نوشہ لوکاں دے دلال تے دماغاں وچ خدا خوف رچاونا چاہندے نیں۔

دوجا وعظ

بابا! جو کوئی تتا منڈائی کردا ہے
تس دے پاؤں تے ساری دا کٹ ہوئیکے
ودھدے ودھدے بجھ دجاوندا ہے تے پاؤ
کالا کر دیندا ہے۔ پر کٹ گھناتاں لہو تے جدا ہے

ایس وچ اوہ برائی کرن والیاں دا حال بیان کردے نیں۔ ایتھے منڈائی دا مطلب اے برائی تے ودھدے ودھدے دا مطلب اے بڑھتے بڑھتے تے بجھ جاوندا ہے دا مطلب اے پکا ہو جاندا اے۔ یعنی جو برائی کردا اے ایس دا سیاہ کردار پکا ہو جاندا اے۔

بابا وڈے سوادوں وانجیا ہووے نبھاگا
سائیں جس نہ منیاں نال جانوسُ آگا
من چت جیندا بھر میاون، تیندا بھاگا

لیکھیں لکھیا تھالا ٹھی سوا دکھا جھاگا
اوتھے ایتھے جھلسی نت کوتا واگا

ایس وچ سوادوں دا مطلب ذائقہ، وانجیا دا مطلب بد قسمت اے بے بھاگا۔ بھر میادا مطلب اعتبار، وہم زدہ ہوا یعنی جو سائیں کے کرم سے محرم ہو گیا وہ بد قسمت ہے۔ جو دل دی وچ وہم رکھدا اے اوس نوں ایس جہان تے اگلے جہان لا ٹھی یعنی سزا برداشت کرنی ہے۔

تریجا وعظ

بابا! جے توں واٹ سچّی سدھی سولی
سوکھی سائیں والیاں دی ملیں تاں کدیں
ناں تھڑیں تے کدیں ناں تھڑیں پر
ایہ وارث سائیں والیاں نال ملیاں
سچے ساتھ رلیاں سچّیاں گلاں
سُنیاں سمجھیاں سچّیاں دے آکھے
لگ لڑیاں چلیاں لبھدی ہے

ایس وچ اوہ حق دی راہ اختیار کرن دا درس دے رہے نیں۔ اوہ آکھدے نیں اگر توں حق تے سچ دا راہ اختیار کر لیں گا تے نہ کسی چیز دی طلب رہوے گی تے نہ کمی۔ پر ایہہ حق دا راہ اللہ والیاں دے نال ملدا اے۔ سچی گلاں کرن تے لکھن والیاں نوں ملدا اے۔

تے ایہ جو لوک ہور بھلے بھرمی ہوئے۔ اپنی کجھی نال بھٹکدے ڈولدے رلدے پھردے ہین سے دُھر دے لکھے نال گھتے ہوئے ہن بھلایاں بھلے ہین وڈیاں بھلاں وچ پھاتھے ہوئے ہن تے گھنیاں بھلویاں دے منہ آئے ہوئے ہین۔ ایہناں نوں کائی سار سدھ ناہیں۔

یعنی جو لوگ سدھا رستہ بھُل گئے ہوئے نیں، اپنی کم عقلی نال ایدھر اودھر جا رہے نیں اوہناں نوں ہن سچے سائیں والے لوگ ہی سدھا راہ وکھا سکدے نیں۔

چوتھا وعظ

نال بابا! سائیں تے سائیں والیاں نال ڈنگیائی
بھلی ناہیں جو آکڑ سی سو اُکھڑی۔ کسے وڈیائی تے
بھیلے ناہین پڑھ کلمہ سچ دا
لَااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ

ایس وچ اوہ آکھدے نیں کہ سائیں تے سائیں دے لوکاں نال دشمنی چنگی نہیں آخر وچ ایہہ غرور اُتر جانا اے۔ پڑھ سائیں دا سچا حق والا کلمہ۔

بابا! جاں حضرت صالح پیغمبر نے ثمود تے قوم اوسدی نوں کفر تھوں ہٹکیا سی تاں اوہناں وڈیائی دے غرور نال اوہناں نوں کجھ نہ جاتا، تے کہنا نہ منیا تے وَیر ہے تا کھجاون لگے تے دکھاون لگے۔

ایس وچ اوہ حضرت ثمود دی قوم دی نافرمانی نوں ایہناں تے عذاب دی گل کر دے نیں۔

نثر دے دوویں اقتباس سدھی سادی مدعا نگاری دا اعلیٰ نمونہ نیں۔ اج دے پڑچولی کہندے نیں جے اردو نثر وچ مدعا نگاری نوں ٹورن والے میر زا غالب تے سر سیّد نیں مواعظ دی نثر جیہڑی دسویں صدی ہجری دے چھیکڑ وچ لکھی گئی اے ایہہ اسب توں وڈا کمال ای مدعا نگاری اے۔

سیانیاں دا قول اے کہ تحریر لکھن والے دی شخصیت دا پرتو ہوندی اے۔ نوشہ گنج بخش دی طبیعت دی حلیمی، بردباری، اخلاقی، ہمدردی، بے لوث خدمت گزاری تے علمیت ورگیاں صفتاں تے خوبیاں نے اوہناں دے فن وچ اجیہی روح پیدا کر دتی اے کہ پڑھن والا متاثر ہویوں بغیر نہیں رہ سکدا۔

حضرت نوشہ دی وفات شاہجہاں بادشاہ دے زمانے وچ ۱۰۶۴ اوچ ہوئی۔ تے ایہناں دی درگاہ شریف خلقت دی زیارت گاہ اے۔

مواعظ نصیحت کرن واسطے ہوندے نیں۔ پنجابی ادب وچ بے شمار مواعظ موجود نیں پر گنج بخش دے مواعظ جو سید نوشاہی نے اپنی تصنیف مواعظ نوشہ پیر وچ لکھیا اے۔ اپنی مثال آپ نیں۔ ایس توں پہلے پنجابی وچ کسے نے وی ایس تفصیل دے نال پورے دین دے احکام نہیں پیش کیتے سن۔ اوہناں نے اپنے مواعظ وچ بہت عمدہ طریقے نال پوری اسلامی تعلیمات تے احادیث نوں بیان کیتا اے۔ اپنے مواعظ وچ اوہناں نے آخرت تے دُنیا دوہاں دا درس پیش کیتا اے۔ پہلے وچ اوہ خدا دی قدرت، ایس دی خود مختاری تے بادشاہت بیان کر دے نیں۔ اوہ سب تے قادر اے ایس تے کسے دا حکم نہیں۔ نال کہندے نیں جو لوگ سدھا رستہ چھڈ بیٹھے نیں اوہناں نوں بزرگ لوگ ہی ٹھیک کر سکدے نیں۔ فیر کہندے نیں جیہڑا سائیاں دے کرم توں محروم اے۔ ایس دے دل وچ وہم اے۔ بُرائی ایس دا مقدر ہو جاندی اے۔ فیر ایس دنیا تے آخرت وچ ایس واسطے بس سزا اے۔ فیر اوہ حق دی راہ اختیار کرن دا درس پیش کر دے نیں۔ سائیں دا رستہ اختیار کرن دا درس۔ جیہڑا سائیں دا رستہ اختیار کر لیندا اے، اوس نوں ایس جہان وچ سب مل جاندا اے۔ اوس نوں دنیا نال کوئی غرض نہیں رہندی۔ اوہ سائیں والا ہو جاندا اے ایس وچ دوویں جہاناں دی بہتری اے۔ فیر کہندے نیں کہ سائیں تے سائیں والیاں نال دشمنی چنگی نہیں۔ آخرت وچ اسرافیل صُور پھوکے گا، ایس دا عذاب اے۔ ایس لئی سائیں دا حق دا کلمہ پڑھو۔ اوس دا حکم پُورا کرو۔ ایس وچ ہی بھلائی اے۔

ایہہ پنجابی وچ سب توں عمدہ اسلامی تعلیمات دا خلاصہ کر دے نیں۔ ایہناں نے ایہہ وعظ اپنے علاقے دے لوکاں دی بھلائی واسطے لکھے سن۔ ایہناں نوں سائیں دا رستہ وکھان واسطے ایہہ اللہ دے سچّے بندے سن۔ ایس واسطے انسانی فلاح واسطے لوکاں نوں نصیحت دا درس دین واسطے اللہ نے ایہناں نوں رکھیا۔ ایہناں نے ایہہ

وعظ ٹھیٹھ پنجابی وچ لکھے تاں جے لوکاں نوں پُوری سمجھ آئے۔ ایہناں نے ایہہ وعظ تقریباً ۹۹۰ھ وچ لکھے سن۔ ایس دی وجہ ایہہ وے کہ ایہناں نے ایس دور وچ حضرت بادشاہ سخی دے ہتھ بیعت کیتی سی۔ تے ایس وچ ایہناں نے تصوف تے توحید دے گہرے مسائل تے ڈونگھے حقائق نوں بیان کیتا اے، جیس توں پتہ چلدا اے ایہہ وعظ ایہناں دے ابتدائی زمانے دے نیں۔

ایہناں دے وعظ سدھارستہ، حق تے سائیں نوں جانن والیاں واسطے اک بہت عمدہ نمونہ نیں۔ ایس توں کوئی وی نصیحت حال کر کے اپنی دوویں جہاناں دی زندگی سنوار سکدا اے۔

❋ ❋ ❋

عبدالمعیز

جنگ نامے تے مرثیے

جنگ نامہ اک ایسی اصطلاح دا نام اے، جو جنوبی ایشیا دے قرون دے دور وچ ابھرن والے ادب دی اک قسم لئی استعمال ہوئی۔ لفظ "جنگ" دا مطلب لڑائی یا جنگ اے تے لفظ "نام" دا مطلب فارسی وچ خط یا دستاویز اے تے، ایہناں دوہاں لفظاں نوں ملا کے "جنگ نامہ" بنداا ے جیہدا مطلب جنگ دے بارے لکھیا گیا دستاویز یا ادب اے۔

جنگ نامے دی ابتدا گیارھویں صدی وچ برصغیر وچ اسلام دی فتح نوں سمجھیا جا سکدا اے جدوں فارسی حکمراناں دی زبان بنی۔ پہلا جنگ نامہ فارسی دے شاعر امیر خسرو دے جنگ نامے نوں سمجھیا جا سکدا اے۔ جو جنگ نامہ، ہندوستان تے منگول حملے دے تاریخ بارے لکھیا گیا۔ مغل بادشاہ اکبر نے اپنے دور وچ اپنی فوجی مہمات تے بہادری بارے کئی جنگ نامے لکھنے دا حکم جاری کیتا۔

جنگ نامے صرف فارسی تک محدود نہیں نیں، تے دیگر زباناں سمیت پنجابی زبان وچ وی جنگ نامے لکھے گئے۔ پنجابی زبان دا اک مشہور جنگ نامہ شاعر شاہ محمد تے "جنگ نامہ شاہ محمد" دے ناں توں لکھیا۔ جیہدے وچ رنجیت سنگھ پچھوں ایس دی فوج ولوں انگریزاں تے دوسرے کجھ ہندوستانی حکمراناں دے خلاف لڑن والی جنگ دا ذکر ملدا اے۔

جنگ نامے تاریخی معلومات داوی اک ذریعہ اے تے جس دور وچ وی جنگ نامے لکھے گئے، اوس دور دی فوجی حکمت عملی، سیاسی، سماجی، ثقافتی تناظر تے کھچاؤ دا اندازہ جنگ نامے توں لایا جا سکدا اے۔

اٹھارہویں صدی دے دوران پنجاب دے علاقیاں وچ ہوون والے تنازعات تے جنگاں دے بارے بیان کرن واستے جنگ نامے نے پنجابی ادب وچ بڑا اہم کردار ادا کیتا۔ ایہہ جنگ نامیاں دے شاعر، مؤرخین تے مصنّفین اوہ لوگ سن جیہناں نے ایہناں جنگاں دے حالات اکھیں دیکھے یا تے قابل اعتماد ذرائع توں معلوم حاصل کر کے ایہہ جنگ نامے لکھے۔ پنجابی جنگ نامے ایس وجہ توں وی اہم نیں کہ جنگ نامیاں وچ مغلیہ حکومت تے برطانوی حکومت دے خلاف پنجابی لوکاں دی جابجا مزاحمت بیان کیتی گئی اے۔

پنجابی جنگ نامیاں وچ ایسا لوک ادب موجود اے جیہدے وچ بہادراں دی شجاعت تے بزدل تے ظالم دے نال نفرت دا درس دتا جاندا اے۔

مرثیے

مرثیے اک قسم دی شاعری یا نوحے ہوندے نیں، جو روایتی طور تے مسلماناں وچ پڑھے جاندے نیں تے خاص طور تے مرثیاں وچ پیغمبر اسلام پیارے نبیؐ دے خاندان تے صحابہ دیاں شہادتاں دا ذکر کیتا جاندا اے کہ کس طرح کربلا دے میدان وچ تمام لوگ شہید ہوئے پر اسلام دا نام زندہ کر دتا۔

جنگ نامے تے مرثیے دا جوڑ

جس طرح جنگ نامے وچ لوکاں دی بہادری دا ذکر ملدا اے ایس طرح مرثیے وچ وی میدانِ کربل وچ موجود حضورؐ دے خاندان تے صحابہ دی بہادری دا ذکر ہوندا اے۔ حق تے باطل دیاں جنگاں وچ اسلام وچ کربلا دا واقعہ اِک بڑی جنگ دے طور تے موجود اے۔ کیوں جے ایس جنگ وچ اک پاسے حضورؐ دے دوہترے اسلام دی پاسبانی کر رہے سن تے دوسرے پاسے یزید دے لوک کھانا تے کدی پانی بند کر کے صحابہ تے ظلم کر رہے سن۔ مرثیے وچ کربلا دے معرکے دا سارا حال آہ وزاری تے شاعری وچ بیان کیتا جاندا اے تے صحابہؓ دی ثابت قدمی تے شجاعت دا ذکر نال نال ملدا اے۔ ایس طرح مرثیہ وی جنگ نامے دی ایک منفرد قسم

بندی اے۔ انج تے پنجابی مرثیہ نگاری وچ بہتیرے شاعراں نے طبع آزمائی کیتی تے بہتیرے مرثیے لکھے پر حافظ برخوردار دا مرثیہ جنگ نامہ امام حسین بے حد منفرد انداز وچ لکھیا گیا۔

حافظ برخوردار نے ایس جنگ نامے وچ کربلا دا واقعہ بے حد خوبصورتی دے نال بیان کیتا کہ پڑھن والا وی جدوں حضورؐ دے دوہترے کربل وچ موجود سی۔ اوس وقت دے کربل دے میدان نوں محسوس کر سکدا اے۔

حافظ برخوردار ایہہ جنگ نامہ حمد باری تعالیٰ نال شروع کر دے تے آکھدے نیں:

خالق خلقت خواہش ہوئی کیتا راز پسارا
نور محمدؐ پیدا ہویا، روشن تھیا اندھارا

فرمایا کہ خالق دی خواہش ہوئی کہ میرا راز پچھانیا جائے تے اوس نے نور محمدؐ پیدا کیتا تے اندھیرے نوں روشن کر دتا۔

حافظ برخوردار نے واقعۂ کربلا توں پہلے جو تمہید بنھی اے ایہدے وچ حافظ نے کربل جان توں پہلے سگوں امام حسنؓ حسینؓ دی جوانی توں پہلے دے واقعات دا وی ذکر کیتا اے کہ کس طرح وقت دے نال نال حضورؐ نوں اپنے دوہتریاں دی تے بی بی فاطمہؓ نوں اپنے لخت جگر دی شہادتاں دا اشارہ ملیا۔ حافظ برخوردار نے اوہناں تمام واقعیاں دا ذکر کیتا اے جس توں بعد امام پاکؑ نے کربل دا رخ کیتا تے کربل دے میدان بارے تے تمام واقعات جو کربلا وچ بیٹے حافظ اوہناں دا وی ذکر کر دا اے۔ امام حسنؑ تے حسینؑ دی شہادت بارے برخوردار فرماندا اے کہ امام حسن نوں زہر دتا۔

اوّل سید حسنؑ نوں ظالم زہر دِواء
سارا قصہ ایس دا برخوردار سنا

امام نوں زہر پلانے بارے شاعر لکھدا اے:

ترے واری اس یار نے دِتا زہر امام
کرے دوا امام پھیر ہووس خیر تمام

تے امام حسنؑ دی شہادت بارے شاعر لکھدے نیں:

پچھے کٹن سرے، سپارے توں قران
پڑھے امام ایہہ لباں تھیں ہویا ختم تمام

حافظ برخوردار نے اپنے جنگ نامے وچ اوہناں تمام واقعات دا ذکر وی کیتا کہ امام حسین دی شہادت توں بعد یزید دا کیہ حال ہویا۔

برخوردار دے ایس جنگ نامے وچ تمام شعر مکالمے دے انداز وچ لکھے گئے۔ جیہدی وجہ توں واقعات دی باریکی نوں وی ودھ کے بیان کیتا گیا اے۔

پنجابی شاعری وچ سبھ توں پہلاں امام پاک دے مرثیے حضرت فرید الدین ثانی دے کلام وچ ملدے نیں۔ ایس توں بعد پنجابی وچ ڈھیر سارے جنگ نامیاں دی تشکیل ہوئی۔ جیہناں وچوں چند اہم نام ایہہ نیں:

جنگ نامہ امام حسینؑ	مصنّف	پیر محمد
جنگ نامہ امام حسینؑ		مولوی رکن الدین
جنگ نامہ امام حسینؑ		مقبل شاہجہاں
جنگ نامہ امام حسینؑ		حامد شاہ عباسی
جنگ نامہ امام حسینؑ		گھلیٹا کاسی
جنگ نامہ امام حسینؑ		مولوی حبیب اللہ

جدید دور وچ وی کئی اک شاعر جنگ نامے لکھن دی روایت نوں قائم رکھی ہوئی نیں۔ جدید دور دے جنگ نامے زیادہ تر قدیم دور توں ایس طرح مختلف ہوندے نیں کہ ایہناں وچ کسی اک فرد دی بہادری تے واقعات دے بارے بہتی گل کیتی جاندی اے۔ (حوالہ کتاب: جنگ نامہ امام حسینؑ، حافظ برخوردار)

❁ ❁ ❁

عمر امجد مغل

ڈائری

۲۳ مارچ ۲۰۲۵ء

اتوار سویرے یار ھاں وجے میری اکھ کھلی اج دا دن تاسی اپنے دن دی شروعات ٹھنڈے پانی نال نہا کے کیتی۔ نہاون توں بعد نیوزی لینڈ تے پاکستان دے وچکار جاری سیریز دا تیجا ٹی ٹونٹی میچ ویکھیا۔ ہاسٹل وچ ٹی وی نہ ہون دی وجہ توں اپنے موبائل تے ای میچ لایا۔ پاکستان دی کارکردگی ویکھ کے دل چھنی ہویا۔ میچ دیکھن دے دوران صفائی وغیرہ شروع کیتی، جیہدے واسطے مینوں صفائی کرن والے عملے دی لوڑ پئی۔ کمرہ صاف کیتا، کپڑے بدلے، اوس توں بعد میں ہک بجے پیشی دی نماز ادا کرن واسطے مسیت روانہ ہویا۔ بعد نماز ادائیگی میری بزنس اینالیٹکس کورس دے گروپ دے نال ہک پروجیکٹ میٹنگ سی، جیہدے وچ اسی دنیا وچ دہشتگردی دی شرح بارے سوالات پورے کیتے۔ فیر انسٹرکٹر نوں بذریعہ ای میل وکھائے۔ میٹنگ مکن توں بعد میں ہاسٹل آیا تے کمرے وچ باری کول بیٹھا تے باہر دا سوہنا نظارہ ویکھن لگیا، فیر ہک گھنٹہ بستر تے لیٹ کے آرام کیتا۔ تتے دن دی وجہ توں کافی روزہ لگ رہیا سی۔ اٹھ کے ویکھیا تے ڈیگر دی نماز داویلا ہو یا پیا سی فیر نماز ادا کیتی۔ ہک دوست نوں کال کر کے پچھیا جو افطاری وچ کیہ کھانا چاہیدا اے۔ اسی فیصلہ کیتا کہ تہذیب بیکرز جا کے افطاری کراں گے۔ میں ہاسٹل پارکنگ توں گڈی لے کے فیز ۴ گیا، دوست نوں چکیا تے تہذیب پہنچے۔ ایتھے اسی سموسے پٹیاں، ڈرم سٹکس تے چکن پکوڑے کھادے، جو واقعی مزیدار سن۔ نیڑے دی مسیت وچ شاماں دی نماز ادا کیتی۔ افطاری توں بعد غنودگی ہو رہی سی، اس لئی نیڑے کوئٹہ ہوٹل گئے تے چاہ پیتی۔ چاہ دوران کیریئر بارے گل بات ہوئی تے لمز وچ لنگھائے گئے چار سالاں دیاں یاداں وی تازہ کیتیاں۔ ایس توں بعد میں اپنے دوست نوں الوداع کیتا

تے واپسی لمز واسطے روانہ ہویا۔ کمرے وچ آ کے پنجابی کورس دا کم کیتا، فیر جم گیا تے لتّاں دی ورزش کیتی۔ تھک ٹُٹ کے کمرے واپس آیا، پروٹین شیک تے کیلے کھادے پھیر سوتے دی نماز ادا کیتی۔ فیر ہک دوست دا پیغام آیا کہ بین مشین کیفے چل کے کافی پینے آں۔ کافی پیتی نال مختلف کھیڈ کھیڈے۔ رات بارھاں تے کرکٹ دا میچ سی جتھے اسی جت گئے۔ میچ جتن توں بعد اسی جانی اینڈ جگنو توں سحری کیتی، لمز واپس آئے، روزے دی نیت کیتی، فجر دی نماز پڑھی تے دن مکایا۔

۲۴ مارچ ۲۰۲۵ء

اج سوموار دا دن یعنی یونیورسٹی تے کلاساں دا دن سی۔ میری اکھ سویرے نوں تے کھلی۔ موسم اج وی واہوا اتا سی۔ نیند پوری نہ ہون دی وجہ توں روزہ واہوا اوکھا لنگھ رہیا سی۔ ٹھنڈے پانی نال نہایا، کپڑے بدلے تے پنجابی دی کلاس دی حاضری واسطے روانہ ہویا۔ پروفیسر زاہد حسن نوں کلاس دا سبق سنایا۔ کلاس مکن توں بعد نیند پوری کرن واسطے کمرے وچ واپس آیا۔ اگلی کلاس دے شروع ہون وچ گھنٹہ پیا ہویا سی۔ ادھا گھنٹا نیند لئی فیر اٹھ کے پیشی دی نماز دا ویلا ہون دی وجہ توں نماز پڑھی، کپڑے بدلے تے فیر بزنس اینالیٹکس دی کلاس لئی ہاسٹل توں روانہ ہویا۔ کلاس وچ ادھے طلباء چھٹی تے سن کیوں کہ ہفتہ وار نوں ایس کورس دا مڈ ٹرم امتحان سی۔ اج کلاس وچ اسی ڈیٹا کلیئرنگ بارے سکھیا۔ کلاس توں واپس آ کے میں واہوا بھکھ محوس کر رہیا سی، روزہ وی اوکھا لنگھ رہیا سی تے موسم وی تتا سی۔ میں فیر ویلا لنگھان واسطے آرام کیتا۔ ۴:۴۵ دا الارم لایا جو ڈیگر دی نماز دے ویلے اکھ کھل جاوے۔ اکھ کھلی، نماز پڑھی، فیر سوچی پیا کہ افطاری کیہ کیتی جاوے۔ دوست دی کال آئی کہ افطاری واسطے سارے نینڈوز چلے آں۔ توں وی تیار ہو جا۔ کپڑے بدلے، فیر سب دے نال افطاری واسطے ٹر گیا۔ اسی نینڈوز گئے تے بڑی ودھیا افطاری کیتی۔ شاماں دی نماز دا ویلا ہویا، جیہڑی فیز ۶ دی ہک مسیت وچ پڑھی۔ فیر لمز چھیتی واپس آ گئے کیوں کہ یونیامورِ دی نوکری دی درخواست دی اج آخری تاریخ سی۔ درخواست پوری

کیتی، فیر لمز مسیت وچ سوتے دی نماز واسطے چلے گئے۔ ایس توں بعد ہاسٹل واپس آ کے جم جان توں پہلاں کیلے تے کھجوراں کھادیاں۔ جم گیا، اوتھے چھاتی تے مونڈھیاں دی ورزش کیتی۔ واپس کمرے وچ آ کے پروٹین شیک پیتا۔ رات ہک بجے فیر دوستاں دے نال پیڈل ٹینس کھیڈن چلا گیا۔ میچ توں بعد اسی کے۔ ایف۔ سی سحری واسطے چلے گئے، واواسواد آیا۔ فیر لمز واپس آ کے فجر دی نماز ادا کیتی تے دِن مکایا۔

۲۵ مارچ ۲۰۲۵ء

اج منگل وار سی۔ میں سویرے یارھاں تے اٹھیا۔ اج لمی نیند کیتی کیوں کہ سویرے کوئی کلاس نہیں ہوندی۔ میں اٹھ کے ہاسٹل دی واشنگ مشین وچ کپڑے دھوتے، فیر نہاتا تے اج دیاں کلاساں واسطے تیار ہویا۔ منگل وار تے دیروار نوں صرف ہک کلاس ہوندی اے کیوں کہ ایہہ میرا گریجوٹنگ سمسٹر اے تے تقریباً سارے کریڈٹ پورے ہو چکے نیں۔ ڈیگر دی نماز ادا کرن توں بعد اپنی اج دی ہک ای کلاس دی حاضری واسطے روانہ ہویا۔ اج میری انٹرڈکشن ٹو بلوچی دی کلاس ہوندی اے۔ اج استاد نے سانویں بلوچی زبان وچ گل بات کرن، اپنا تعارف کروان تے ہور بندیاں دا تعارف پیش کرن بارے سکھایا۔ کلاس مکن توں بعد میں لائبریری گیا تے پنجابی دی اسائنمنٹ تے کم شروع کیتا، جیہڑی اج رات بارھاں تے جمع کروانی سی۔ اسائنمنٹ وچ تِن دن دی ڈائری لکھنی سی۔ فیر ڈیگر دی نماز داویلا ہویا تے نماز ادا کرن واسطے مسیت ول روانہ ہویا۔ نماز ادا کرن توں بعد دو دوستاں دی کال آئی تے اوہناں نے اپنے ول HBFC وچ افطار دی دعوت دتی۔ میں ہاسٹل واپس آیا تے دعوت لئی تیار ہون لگ پیا۔ ساڈھے پنج وجے میں افطار لئی روانہ ہویا۔ راستے وچ لیئرز بیکری تے رکیا، کیک خریدیا فیر اوہناں دے گھر پہنچیا۔ نال نال ہور دوست وی اوتھے پہنچن لگے۔ میزبان دوستاں نے بڑی ودھیا کیٹرنگ کرائی ہوئی سی۔ کھانا کمال دا سی، ون سونے کھانے پکائے ہوئے سن۔ بعد وچ مِٹھا پیش کیتا گیا اوہ وی بڑا ودھیا سی۔ کھانے توں بعد شاماں دی نماز ادا کیتی۔ چاہ پیتی، نال پتے کھیڈنا شروع کیتے۔ ساریاں نوں بڑا سواد آیا۔

سوتے دی نماز ادا کر کے تھوڑا چِر بیٹھے، میزباناں دا شکریہ ادا کیتا تے فیر سب واری واری خیر باد کہن لگے۔ جاندیاں جاندیاں اسی فیصلہ کیتا کہ سحری لئی گجرانوالہ جیہڑی میری جائے پیدائش اے، چلیے۔ سب نوں میزبان بنن دی درخواست کیتی۔ رات ہک دے نیڑے اسی چار گڈیاں تے گجرانوالہ روانہ ہوئے۔ اوتھے بٹ سویٹس توں حلوہ پوڑی دی سحری کیتی، تتر پھڑیا، فیر واپس لاہور آ گئے اج دا دن بڑا یاد گار سی۔

❋ ❋ ❋

زینب رشید

ڈائری

۲۳ مارچ ۲۰۲۵ء اتوار

اج سویرے میری اکھ کافی جلدی کھُل گئی سی۔ اک اوس طرح ای رمضان وچ سویرے تے شام دا حساب نہیں رہندا تے جدوں اک طالبِ علم پورا ہفتہ سکول کالج جائے تے اتوار نوں آپے ہی جلدی اُٹھ جاندا اے۔

اسی سب گھر والیاں نے دن بارھاں وجے میرے نانا دی بھین دے گھر جان دا ارادہ کیتا ہویا سی۔ اوہ خاتون کافی ودھ عمر دے نیں تے اسی اوہناں نوں عید توں پہلاں ملنا چاہندے سی۔ ایس واسطے اسی سب عین وقت تے گھر توں ٹر پئے۔ اتوار ہون دی وجہ توں سڑکاں اتے رش نہیں سی۔ ادھے گھنٹے وچ اسی اوہناں دے گھر پہنچ گئے تے ادھا گھنٹہ اوہناں دے کول بہہ کے اسی واپسی دی راہ لئی رستے توں کجھ پھل خریدیا تے اوس ہی دوران خیال آیا کہ میری اک خالہ نوں وی اج ہی مل آیئے جیہناں نوں اک دو دناں وچ ملنا سی کیوں کہ اوہ شکروار نوں کینیڈا جا رہے نیں۔ سو اسی اوہناں دے گھر وی چلے گئے۔

جدوں اسی مڑ کے آپنے گھر آئے تے سب تھک چکے سی لہٰذا بس نماز پڑھی تے سوں گئے۔ ڈیگر دی نماز ویلے دوبارہ اٹھے تے نماز پڑھ کے اسی ٹی وی دے اگے بہہ گئے کیوں کہ رمضان وچ اک چینل تے بڑا اچھا کوئز مقابلہ ہوندا اے جیہدے توں سانوں ہر روز کجھ نواں سِکھن نوں ملدا اے۔ فیر اسی روزہ افطار کیتا تے تھوڑی دیر بعد کھانا کھالیا۔ فیر سب لوگ اپنے اپنے چھوٹے موٹے کم کاج کرن لگ پئے تے مینوں یاد آیا کہ میں وی پنجابی دی ڈائری لکھنی اے۔ میں چنگی جیہی چاء بنوائی تے نال ایہہ کم کرن لگ پئی۔ ایہہ کم کر کے میں بس

اپنیاں چیزاں تھیلے وچ پاواں گی تے فیر سون واسطے چلی جاواں گی کیوں کہ کل توں یونیورسٹی دا اک ہور ہفتہ شروع ہونا اے۔

۲۴ مارچ ۲۰۲۵ء سوموار

اج میرا یونیورسٹی جان دا بالکل دل نہیں سی مگر جانا تے ضروری سی۔ میں اپنی پہلی کلاس شروع ہون توں تھوڑی دیر پہلے ای سوں کے اٹھی تے جدوں میں لمز پہنچی اوس ویلے مینوں احساس ہویا کہ میں دیر کر دتی اے لیکن جدوں کلاس وچ پہنچی تے پتہ چلیا کہ ریاضی دے استاد وی اج تھوڑا دیر نال آون گے۔ خیر، کجھ دیر بعد اوہ آ گئے۔ میں ریاضی تے فیر پنجابی دوناں کلاساں لے کے اپنی بھین دی یونیورسٹی گئی۔ اوہ ایف۔ سی۔ یو وچ علم النفسیات (سائیکالوجی) دی طالبہ اے۔ او تھوں اسی دونوں بھیناں لبرٹی بازار گئیاں تے عید واسطے چوڑیاں تے مہندی خریدی۔ چوڑیاں دا بھاء بہت ودھ سی لیکن لوکاں دا رش ویکھ کے لگ رہیا سی کہ سب چیزاں مفت مل رہیاں نیں۔

جدوں اسی گھر پہنچے تے شدید پیاس لگی ہوئی سی۔ ہُن گرمی کجھ زیادہ ہو گئی اے تے روزے وچ پیاس دا کافی احساس ہوندا اے۔ شام نوں مینوں اُٹھن اچ سویر دی طرحاں ہی دیر ہو گئی مگر اچھا ہویا کہ میں شاماں دی نماز توں پہلے اٹھ گئی۔ افطاری بالکل تیار سیگی تے نال ای میں ایہہ ویکھیا کہ میری بھین نے ساڈے گلاب دے پھُلاں نوں چنگا پانی لایا ہویا ہے۔ ایس واسطے مینوں کوئی وی کم کرن دی لوڑ نہیں سی۔ بس افطاری کیتی تے فیر ٹی وی دے اگے بہہ گئی کیوں کہ پڑھائی کرن دا دل نہیں کر رہیا سی۔ لیکن ٹی وی تے کجھ خاص نہیں آ رہیا سی تے فیر میں اپنی کتاب چُک لئی جیہڑی میں لائبریری توں لئی ہوئی اے۔ مینوں اپنے اک کورس وچ کلاس نوں صوبہ سندھ دے بارے اچ دساں اے تے ایہہ کتاب وی اسی بارے اچ اے۔ میں تھوڑی جِہ کتاب پڑی تے فیر سوں گئی۔

۲۵ مارچ ۲۰۲۵ء منگل وار

منگل وار نوں جیہڑی میری پہلی کلاس ہوندی اے اوہ مینوں بہت چنگی لگدی اے لیکن جس طرح عید نیڑے آ رہی اے سب دی اچھیاں وچ اک ایہہ وی اے کہ ہُن بس یونیورسٹی بند ہو جاوے۔ کلاس پونے دس شروع ہونی سی تے میں نو وجے ای لنز پہنچ گئی۔ میں سوچیا کہ بہار دی رُت اے تے میں ذرا کیمپس دی سیر کرنی آں۔ ایکڈیمک بلاک دے باہروں میں لاء سکول ول تے فیر کڑیاں دے ہاسٹل ول گئی۔ اوتھوں میں مسجد ول مڑی تے مینوں اپنی اک سہیلی مل گئی۔ فیر اسی دونوں آئی۔ ایس۔ ٹی گئے تے اوتھے بہہ کے کجھ کم کیتا۔

جدوں کلاس داویلا ہویا تے میں سکول آف ایجوکیشن پہنچ گئی۔ میرا خیال اے کہ میری ایس تِن دناں دی ڈائری دی سب توں چنگی گل ایہہ اے جیہڑی میں اگے لکھی اے۔ میری استانی صاحبہ نے کلاس وچ کہیا کہ جدوں انگریز برصغیر تے حکومت کر رہے سیگے اوس ویلے فوج وچ زیادہ تر پنجابی سن تے اگر پنجابی نوں ذرا اہمیت دے دتی جاندی تے فوج نے بے قابو ہو جانا سی۔ نال ای کلاس دی اک کڑی ایہہ دسن لگ پئی کہ کس طرح پنجابیاں نوں انگریزاں دے وقت وچ باقیاں کولوں اُچا مقام ملیا۔ ایہہ گل اوس کڑی نے کافی برے انداز وچ کیتی۔ مینوں ایہہ چنگا نہیں لگیا تے فیر میں سب نوں دسیا کہ انگریزاں نے پورا برصغیر اپنے قبضے وچ لے لیا سی مگر پنجاب تے قبضہ کرن اچ اوہناں نوں اک لما عرصہ لگیا تے فیر اوہناں نے پنجاب دی ثقافت اتے حملہ کر کے تے ایتھے اپنی حکومت قائم کیتی۔ ایس وجہ توں اج اسی ویکھدے آں کہ پنجابی بولن والے نوں حقارت دی نگاہ نال ویکھیا جاندا اے۔ استانی صاحبہ نے وی میری گل دی تائید کیتی تے مینوں خوشی ہوئی کہ میں ایسے لوکاں وچ بہہ کے پنجابی دے ماضی دے بارے وچ دسیا جو لوک اردو بولن وچ وی شرم محسوس کر دے نیں۔

اگلی کلاس وی لئی تے فیر میں گھر آ کے سوں گئی۔ ڈیگر دی نماز توں بعد اپنی بھین نوں لین ایف۔ سی۔ سی۔ یو۔ گئی تے رش دی وجہ توں میں افطاری توں کجھ ویلا پہلے گھر پہنچی۔ افطاری دے بعد میں سوں

گئی تے اک دم میری اکھ کھلی تے مینوں اج دی ڈائری لکھنی یاد آئی۔ ہُن ساڈھے یارھاں ہو گئے نیں تے بس میں ایل۔ ایم۔ ایس تے ایہہ کم جمع کروا کے اک واری فیر سوں جاواں گی۔

❋ ❋ ❋

نمود، شمارہ ۱۴، ۲۰۲۵ء

مریم طاہر

ڈائری

۲۳ مارچ ۲۰۲۵ء

اج اتوار دا دن ہے۔ مینوں اتوار بہت پسند اے کیوں کہ میں دیر نال اٹھدی ہاں۔ رمضان وچ میرا معمول پہلے ای خراب اے تے مینوں سوون لئی گھٹ وقت ملدا اے۔ ایس لئی اَج میں اک وجے اُٹھی۔ جدوں میں اٹھ کے ٹی۔وی والے کمرے وچ گئی تے میرے نانا اوتھے بیٹھے سی۔ اوہناں نے مینوں دیر نال آن تے تریوی مارچ دی پریڈ توں محروم ہون تے ڈانٹیا۔ اوہناں دی ایس گل نے مینوں احساس دلایا کہ اج تے بہت اہم دن ہے جیہنوں میں بھلی بیٹھی سی۔ میں ایس گل توں پریشان ہوئی تے ایہہ عہد کیتا کہ ہن توں میں اہم تاریخاں دا خیال رکھاں گی۔ میں ایسی خیال وچ سی کہ میرے ماں پیو کمرے وچ داخل ہوئے تے میں کافی دیر تیک اوہناں نال گلاں باتاں کیتیاں کیوں کہ باقی ہفتے وچ مصروفیات دی وجہ توں اوہناں نال بیٹھنے دا وقت نہیں ملدا۔

تِن وجے تک میں پیشی دی نماز پڑھی تے فیر اپنی ماں نال عید دے کپڑیاں دی خریداری کرن بازار چلی گئی۔ ٹریفک دی وجہ توں اسی چار وجے تک بازار پہنچے۔ کپڑیاں دی دکان وچ وی بہت رش تے بھیڑ سی۔ تِن دکاناں پھرن دے بعد مینوں آخر کار اک لباس لبھ گیا۔ پر اوہ وی غلط سائز دا سی۔ دکاندار نے سانوں دسیا کہ میرا سائز دو جی برانچ تے دستیاب اے۔ ہن ڈیفنس جان دا تے وقت نہیں سی تے اسی فیصلہ کیتا کہ کل اوتھوں کپڑے چُک لاں گے۔ ساڈھے پنج تک اسی گھر پہنچے تے دیگر دی نماز پڑن بعد میں فروٹ چاٹ کٹن وچ اپنی ماں دی مدد کیتی۔ افطاری بنان دی افرا تفری وچ پتہ ہی نہیں لگیا کدوں اذان ہو گئی تے روزہ کھل گیا۔ روزہ کھول کے میں کجھ

دیر آرام کیتا تے فیر اپنی ماں نال مسجد جا کے تراویح پڑھن دی تیاری کیتی۔ میرے گھر دے نال والی مسجد وچ عورتاں دی تراویح داوی اہتمام کیتا جاندا اے تے مینوں اوتھے جا کے بہت چنگا لگدا اے۔

تراویح توں واپس آ کے میں چائے پیتی۔ روزہ کھولن دے بعد توں لے کے ہن تک ایہہ میرا چائے دا دوجا کپ سی۔ میری ماں میری ایس عادت توں پریشان ہوندی اے پر مینوں چائے پینا بہت پسند اے۔ ایس دے بعد میں اپنے کمرے وچ گئی تے یونیورسٹی دا کم کاج کرن دی کوشش کیتی۔ یارھاں وجے میری ہک پروجیکٹ واسطے آن لائن میٹنگ سی گی۔ اوس توں پہلے میں اپنے حصّے دا کم مکایا تے فیر میٹنگ کیتی۔ ایس توں بعد میں شکر کیتا کہ باقی دا کم میں چھن چھن وار نوں کر لیا سی تے فیر سونے دی تیاری کیتی کیوں کہ کجھ گھنٹیاں وچ مینوں فیر سحری واسطے اٹھنا سی۔ شب بخیر

۲۴ مارچ ۲۰۲۵ء

اج سوموار ہے تے سحری لئی جاگنا بڑا ہی اوکھا سی کیوں کہ مینوں کجھ گھنٹیاں وچ فیر یونیورسٹی لئی اُٹھنا سی۔ سحری کرن میں کھانے والے کمرے پہنچی تے پہلے تے میری ماں نے مینوں معمول دا جھڑکیا کیوں کہ میں ہک وار فیر دیر نال آئی سی تے دَہ منٹ وچ اذان ہونی سی۔ خیر میں چھیتی نال اپنی جگہ تے بیٹھی تے کھانا شروع کیتا۔ بھاویں مینوں پراٹھا زیادہ چنگا نہیں لگدا لیکن میں چپ چاپ اوہ کھادا کیوں کہ ورنہ میری ماں مزید غصہ ہوندی۔ اوہ سوچدی اے کہ پورا دن گزارن دی طاقت صرف پراٹھے توں ہی آندی اے۔ سحری کرن دے بعد میں کمرے وچ آئی تے فجر دی نماز پڑھی۔ میں سوچیا سی کہ میں فجر دے بعد قرآن پڑھاں گی لیکن ہن مینوں بہتی نیند آگئی سی تے میں اپنی سوچ تے مسکرا کے واپس سوں گئی۔

نوں وجے میرا الارم وجیا تے میں چھیتی نال یونیورسٹی لئی تیار ہوئی کیوں کہ کجھ دیر وچ میری کلاس تھی۔ میری یونیورسٹی میرے گھر توں ویہہ منٹ دی دوری تے ہے لیکن اوتھے جا کے پارکنگ لبھنی اوکھی ہو

جاندی اے۔ ایس واسطے میں چھیتی نال تیار ہو کے گھر توں نکلی۔ خدا دا شکر ہے میں ویلے سر کلاس وچ پہنچ گئی۔ اج پنجابی دی کلاس وچ اسی جلیانوالہ باغ دے ۱۹۱۹ء دے واقعے دے بارے وچ پڑھیا۔ اوہناں دی افسوسناک کہانی نے مینوں کل دی خبر اں دی یاد دلا دتی جتھے فلسطین تے ہک وار فیر حملیاں دا ذکر سی۔ مینوں اوہ یاد کر کے بڑی تکلیف ہوئی تے میں کلاس وچ بیٹھے دل وچ اوہناں لوکاں لئی دعا کیتی۔ کدی کدی میں بہت بے بس محسوس کر دی ہاں کہ میں اوہناں لئی کجھ نہیں کر سکدی تے خیر دعا ہی میری مایوسی گھٹ کرن وچ مدد کر دی ہے۔

کلاس دے بعد میں کجھ ویلے لئی اپنے دوستاں نال بیٹھی تے اوہناں نوں اتوار دے دن بارے پچھیا۔ اس دے بعد میں اپنے معاشیات دے پروفیسر نال ملن گئی جیہدے نال میں آن والے بجٹ تے ہک تحقیقی پروجیکٹ کر رہی واں۔ عالمی بینک اس منصوبے نوں فنڈ دے رہیا اے تے مینوں اس تے کم کرنا بہت چنگا لگدا اے۔ ایہہ کم ختم کرن دے بعد میں گھر لئی نکل گئی تے کل والے دکاندار دے مطابق میرا سائز دستیاب سی۔ آخر کار مینوں اپنے سائز دا لباس مل گیا تے اوہنوں خرید کے میں گھر لئی روانہ ہوئی۔ گھر پہنچ کے میں تھوڑے ویلے لئی آرام کیتا تے فیر نماز پڑھ کے افطاری دی تیاری کیتی۔

افطاری توں بعد مینوں بڑی نیندر آ رہی سی لیکن میں ہمت کیتی تے تراویح پڑھن اپنی ماں نال مسجد گئی۔ اوتھوں واپس آ کے میں اس نیت نال سونے دی تیاری کیتی کہ میں صبح چھیتی اٹھاں گی تے یونیورسٹی دا کم کراں گی۔

۲۵ مارچ ۲۰۲۵ء

اج منگل وار ہے۔ سحری کرن دے بعد میں نوں وجے دا الارم لا کے سوئی۔ صبح اُٹھ کے مینوں پتہ لگیا کہ میری اج دی کلاس آن لائن اے۔ ایس واسطے میں اج یونیورسٹی نہیں گئی تے گھر توں ای پڑھائی کیتی۔ آن لائن کلاس نے مینوں کووڈ دے زمانے دی یاد دلا دتی تے میں ربّ دا شکر کیتا کہ اوہ ویلا وی گزر گیا۔

دوپہر دے ہک وجے تک میری کلاس ہو گئی تے فیر میں اپنے معاشیات دے بجٹ والے کم نوں پورا کیتا۔ اوہنوں پورا کرن وچ میرے دو گھنٹے لگ گئے جیہدے بعد میں پیشی دی نماز پڑھی تے اپنی ماں نوں بازار لے گئی۔ میری ماں نوں رشتے داراں نوں عید تے دین لئی تحفے دے طور تے کپڑے خریدنے سی کیوں کہ عید منان لئی اسی اپنی دادی دے گھر جاندے ہاں۔ میں اپنی ماں نوں آکھیا کہ جلدی کرو کیوں کہ گھر پہنچن تے مینوں اپنا کم پورا کرنا سی۔ میری ماں میری گل سن کے ہس پئی تے آکھیا مینوں تیرا کم یاد اے کیوں کہ توں دو دن توں مینوں پنجابی دے لفظاں بارے پُچھ رہی آں۔ ایہہ سن کے مینوں وی ہنسی آ گئی تے اسی گھر لئی روانہ ہوئے۔

گھر پہنچ کر میں تھوڑے ویلے لئی پنجابی دا کم کیتا تے فیر اپنی ماں دی مدد کرن باورچی خانے چلی گئی۔ ایتھے مینوں میرے گھر کم کرن والے چاچا مِل گئے۔ مزے دی گل ایہہ ہے کہ چاچا میرے گھر وچ میرے پیدا ہون توں پہلاں دا کم کر رہے نیں۔ میری ماں کہندی ہے کہ بچپن وچ میں اپنے ماں پیو نال ناراض ہو کے چاچا دے نال روٹی کھاندی سی۔ ایہہ گل یاد کر کے مینوں اج وی ہنسی آندی اے۔ ایس واسطے شاید اج وی چاچا نال گل کر کے مینوں بہت ای چنگا لگدا اے۔ اج اوہ مینوں اپنے پُتر بارے دس رہے سی جو اگلے سال توں حافظ بن جاوے گا تے مسجد وچ تراویح پڑھائے گا۔ اوہناں دی گل سُن کے میں بہت خوش ہوئی تے چاچا نوں مبارک باد دتی تے آکھیا کہ اِس خوشی وچ اَج چنگے جیہے پکوڑے کھلا دیو۔

افطاری دے بعد میں ہک وار فیر اپنی پنجابی دی ڈائری مکمل کرن دی کوشش کیتی اس نیت نال کہ تراویح توں واپس آ کے میں ایہنوں جمع کرا دیواں گی۔

❁ ❁ ❁

ایمان عتیق

ڈائری

۲۳ مارچ ۲۰۲۵ء

اج اتوار سی۔ عام طور تے ایہہ دن میرے لئی آرام تے سکون والا ہوندا اے، پر ایس واری تھوڑا وکھرا سی۔ چھن چھن وار والے دن میں کجھ سہیلیاں نوں افطاری تے بلایا ہویا سی۔ کھان توں بعد لاہور دی رہائشی تے واپس چلیاں گئیاں پر میری تِن عزیز ترین سہیلیاں جیہڑیاں ہاسٹل وچ رہندیاں نیں، رات گزارن نوں میرے گھر ہی رہ گئیاں۔ اسی سحری تک جاگدے رہے تے خوب گلّاں کیتیاں۔ لطیفے تے کہانیاں اور سمیسٹر دی تھکن وچوں تھوڑا باہر نکل کے ہسّے اور کجھ دیر واسطے پڑھائی نوں بالکل بھلا دتّا۔

سحری توں پہلاں میں امّی جی دے نال مل کے سب لئی سحری تیار کیتی۔ کھان توں بعد آخر کار سب سون لئی لیٹ گئے۔ سویرے میری اکھ جلدی کھل گئی۔ حالاں کہ راتی بہت دیر نال سوئی ساں پر میں فیر وی سویرے اٹھ گئی۔ ایہہ میرے بچپن دی عادت اے بھلے میں کنّاں ہی دیر نال سوواں پر فیر وی اکھ سویرے سویرے کھل جاندی اے۔ کمرے توں باہر نکلی تے ابّو جی نوں گھر دیکھ کے خوشی ہوئی۔ اتوار ای اوہ دن اے جدوں مینوں اوہناں دے نال کُجھ وقت سکون دے نال گزارن دا موقع ملدا اے۔ کیوں کہ اوہ ہفتے والے دن وی اکثر اپنے مریض ویکھن لئی ہسپتال چلے جاندے نیں۔ اوہ بیٹھے ٹی وی ویکھ رہے سن، میں وی نال بہہ گئی۔ ٹی وی تے یومِ پاکستان دی پریڈ لگی ہوئی سی جیہڑی ایوانِ صدر توں براہِ راست نشر ہو رہی سی۔ بالکل پھسپھُسی جیہی لگی۔ ناں اوہ لش پش تے ناں اوہ خوشی۔ تھوڑی جیہی مایوسی ہوئی۔ سوچیا جو، اسیں اپنے ملک نوں کِتھے لے جا رہے آں۔ غیر یقینی سیاسی صورتحال تے ودھدی مہنگائی نے سب پاکستانیاں دے جذبات تے ٹھنڈ پا دتّی اے۔

مینوں اپنا بچپن یاد آ گیا۔ مینوں لڑاکا جہازاں دا بڑا ای شوق سی۔ میرے ابّو نے مینوں اوہناں دے سارے ناں یاد کروائے سن۔ اک واری پریڈ نوں اسلام آباد جا کر ویکھن دا وی موقع ملیا۔ ہر سال فلائی پاسٹ دا انتظار کر دی رہندی ساں۔ جے۔ ایف ۱۷ تھنڈر ہمیشہ توں میرا پسندیدہ رہیا اے۔ اوہدے انجن دی گرج تے اوہدے بعد شیر دل فارمیشن دیاں آوازاں نال میرے رونگٹے کھڑے ہو جاندے سن۔ جدوں صدر نے قوم نوں خطاب کرنا شروع کیتا، میں تے ابّو جی ویکھدے تے سُندے رہے، پر اندروں افسوس ہویا جدوں اوہ لکھی ہوئی تقریر وی ٹھیک نال نہ پڑھ سکے۔ ابو جی آخر کار بولے کہ پاکستان ایس توں بہتر دا حقدار اے۔ میں سوچیا شاید اوہ وقت آ گیا اے جدوں ہر پاکستانی نوں اپنے حصّے دا قدم چک کے اِس ملک وچ بہتری واسطے اپنا کردار ادا کرنا چاہیدا اے۔ میں کمرے وچ جا کے ویکھیا تے میریاں سہیلیاں حلے وی گہری نیند سُتیاں سن، تے جدوں اٹھ کے جان لئی امّی جی توں اجازت منگی تے اوہناں نے کہیا کہ ہُن تے فیر افطاری دا وقت ہون والا اے۔ تسی ہُن کھانا کھا کے ہی جُلنا۔ چوں کہ ایہہ رمضان دے آخری دس دناں وچوں اک طاق رات سی۔ میں امّی تے وڈّی بھین دے نال تراویح پڑھن لئی نیڑے والی مسجد چلی گئی۔ مسجد وچ جا کے رمضان دی رحمت دا احساس ہویا۔ میں سوچن لگ پئی کہ ایہہ رمضان کنّاں مصروف گُزریا اے۔ کم کاج وچ پے کے عبادت تھوڑی پِچھے رہ گئی۔ میں عزم کیتا کہ آن والے دناں وچ زیادہ دھیان نال کراں گی۔ اَٹھ رکعتاں پڑھ کے گھر واپس آ کے میں اپنا کم مکایا۔ بیگ تیار کیتا کیوں کہ ہفتے دی شروعات اے تے مینوں واپس کیمپس جانا اے۔ میری کلاس اٹھ بجے اے، تے ایس لئی مینوں سویرے نکلنا پینداا اے۔ ہُن میں سَون لگی واں، سحری توں پہلاں تھوڑی نیند پوری کر لئیے۔ ربّ راکھا

۲۴ مارچ ۲۰۲۵ء

سوموار دا دن ہمیشہ اک تھکاون والا دن ہوندا اے۔ ہفتہ شروع ہوندیاں ای پورے ہفتے دے کم تے ذمہ داریاں بارے سوچ سوچ کے بندہ تھک جاندا اے۔ سارا دن کلاساں لئی وکھرے بلاکس وچ نسدے

نسدے گُزریا۔ روزے دے دوران دماغ وی سُتا رہندا اے۔ جیویں تیویں کر کے واپس کمرے پہنچی تے روم میٹ نے یاد کرایا کہ اساں دوواں دی اج بیوٹی پارلر وچ اپائنمنٹ اے۔ اج کل پارلر والیاں وی خوب نخرے دکھاندیاں نیں تے آسانی نال وقت نہیں دیندیاں۔ اسی کافی دناں توں ایہدی اڈیک وچ لگے ساں۔ اج آخر کار ویلا کڈھ کے ٹیکسی منگائی تے سیلون چل پئے۔ ساڈا خیال سی کہ دوپہر دے ویلے تھوڑا رش گھٹ ہووے گا پر اوتھے تے زنانیاں دی لَین لگی ہوئی سی۔ بالکل مچھلی منڈی والا ماحول بنیا سی۔ زیادہ تر زنانیاں عید دی تیاری واسطے آئیاں سن، کوئی اپنے وال سیٹ کروا رہی سی تے کوئی اپنے ناخن۔ پاکستان وچ عید آن توں پہلاں جو ہلچل شروع ہوندی اے اوہ وی دیکھن والی ہوندی اے۔ دوکاناں تے سیلاں لگ جاندیاں نیں۔ بازاراں وچ رش تے ہر پاسے رونق لگی ہوندی اے۔ سیل دے باجود قیمتاں گنجائش توں باہر ہوندیاں نیں۔ اجکل مینوں عید دا اینا مزہ نہیں آندا جنّا اپنے بچپن وچ آؤندا سی۔ سادہ رسم ورواج ہوندے سی عید توں اِک دن پہلاں مہندی لگانا، چاند رات نوں سب دوستاں دے نال مل کے چوڑیاں خریدنا تے خوشیاں منانا۔ جدوں میں چھوٹی سی تاں عید دا مطلب ہوندا سی واہ کینٹ جانا، اپنے دادا دادی کول، پاپا تے دادا ابّو سویرے سویرے عید دی نماز پڑھن چلے جاندے سن تے اسی باقی سارے اوہناں دے واپس آن تک تیار ہوندے رہندے ساں۔ ابّو ہمیشہ میرے تے بھیناں لئی رنگ برنگے غبارے لے کے آندے سن۔ جدوں اوہ واپس آندے تاں اسی زور نال ''عید مبارک!'' کہندے تے اسیں اپنی عیدی لئی بے تاب ہوندے ساں۔ اوہ بچپن دیاں یاداں اج وی دل وچ بسیاں ہوئیاں نیں۔ ہُن دادا دادی وی نہیں رہے تے اِک بھین وی پردیس وچ رہندی اے۔ ایس لئی عید ہُن بالکل وکھری اے۔ پر اوہ عید والی روح اور احساس کسے نہ کسے روپ وچ زندہ اے۔ لگ بھگ اِک گھنٹا انتظار توں بعد ساڈی واری آئی تے میں لمیاں سوچاں توں باہر آئی۔ بال کٹاون توں بعد اسی افطاری لئی کجھ کھانا لیا تے واپس کیمپس چلے آئے رات نوں میری آن لائن میٹنگ وی سی۔ جدوں میٹنگ ختم ہوئی تاں مینوں لگیا جیویں میری ساری توانائی ختم ہو گئی

اے۔ میں سوچیا کہ ہُن آرام کر لینا چنگا اے کیوں کہ ایہہ ہفتہ وی خوب تھکاون والے ہفتیاں وچوں ہوئے گا۔ ہن میں ڈائری بند کر کے لمّی پین لگی آں۔ ربّ راکھا

۲۵ مارچ ۲۰۲۵ء

اج بے حد گرمی سی۔ رمضان دا آغاز بارشاں تے ٹھنڈی ہوا واں نال ہویا سی، پر ہُن محسوس ہوندا اے کہ لاہور وچ گرمی پورے زور نال آ پہنچی اے۔ اوہ قسم دی گرمی جو بندے دے جسم نال چمٹ جاندی ہووے، جدوں ای باہر قدم رکھو روزے ہُن صرف لمبے نہیں لگدے، اوہناں دیاں گھڑیاں وی لمیاں لگن پئیاں نیں۔ اج سویرے میری کوئی کلاس نہیں سی، جیہڑا اک سکون دا لمحہ سی۔ میں تے اِک دوست آپس وچ ملے تا کہ نوکریاں دی تیاری لئی کچھ گل بات کریئے۔ عجیب گل اے۔ مارچ کناں تیزی نال نکل گیا اے۔ ہر گُزرے دن دے نال لزتوں رخصتی دی گھڑی ہور قریب آندی جا رہی اے۔ ایہہ احساس اکثر ہوندا اے۔ اِک پل میں کوورلیٹرز تے نوکریاں دے پورٹلزنوں ویکھ رہی ہوندی آں تے اگلے پل یونیورسٹی دی زندگی ختم ہون دا خیال دل وچ آ بیٹھدا اے۔ جدوں اسی سب عید دی چھٹی توں واپس آواں گے صرف اک مہینہ بچ جاوے گا۔ میں خود نوں ایہہ یاد کراندی آں کہ ہر اختتام نال اک نواں آغاز وی ہوندا اے۔ دوپہر نوں میں اپنی جرمنی وچ رہن والی بھین نوں کال کیتی۔ کافی دن ہو گئے سن کہ اسی ٹھیک طریقے نال گل نہیں کیتی سی۔ اوہدے کول اک بلّی اے ''نمبس'' جیہنوں اوہ سچ مچ بچے دی طرح پالدی اے۔ اوہنے ویڈیو کال تے مینوں نمبس دی نویاں چالاکیاں دکھائیاں۔ ساڈی گل رمضان بارے وی ہوئی۔ اوہ کہن لگی کہ اوتھے روزے بڑے لمبے ہوندے نیں، تے اِک پل لئی میں شکر ادا کیتا کہ لاہور وچ سورج جلدی غروب ہوندا اے۔ کدی کدی دُوری نال نظریہ بدل جاندا اے۔ اوہدی زندگی بارے سن کے مینوں اپنی زندگی تھوڑی ہور آسان محسوس ہوئی۔ اوہدے بعد آخر کار مینوں اپنا کجھ کم کرن دا موقع ملیا۔ ایہہ پچھلے دناں وچ سر زاہد حسن دی پنجابی کلاس لئی جیہڑیاں ڈائریاں لکھیاں

نیں، اوہ مینوں بڑے مزے دیاں لگیاں نیں۔ اوہناں نے مینوں اپنی مادری زبان نال جڑن دا اک نیا احساس دِتّا ہے، جیہڑا میں پہلے کدی محسوس نہیں کیتا سی۔ ایس سب نوں سوچ کے مینوں احساس ہویا اے کہ اپنی ثقافت تے زبان نوں سمجھنا کناں ضروری اے۔ میر اخیال اے ہُن ایہہ انٹری مکانی چاہیدی دے تاکہ میں بروقت جمع کرا سکاں۔ شاید میں ایس نوں جاری وی رکھاں اور اگلے دناں نوں وی لفظاں وچ ڈھالنے دی کوشش کراں۔ اگلی واری تک، ربّ راکھا۔

❋ ❋ ❋

علینہ ذکریا

ڈائری

۸ نومبر ۲۰۲۴ء

اج میرا موڈ کافی خراب سی، تے کوئی خاص وجہ نہیں سی بس محسوس ہو رہیا سی اج دا دن بُرا گزرے گا۔ شام چھ بجے، فوٹو لمز دا ایونٹ ''اپنوں کے نام'' ہو رہیا سی تے ایس ایونٹ داناں سُن کے میں سوچیا کہ میں اپنے والد صاحب نوں خط لکھاں، کیوں کہ کجھ چیزاں اسی اپنے والدین نوں سدھے منہ یا فون تے نہیں کہہ سکدے۔ جیسے ہاسٹل وچ رہ کے، پڑھائی دا بوجھ، نیند دی کمی، اوہ تھکن جیہڑی لگدی ہے جے دن رات پڑھائی کر کے بھی کوئی خاص نتیجہ نہ ملے۔ ایہہ سب کجھ ہمیشہ دل وچ دبا کے رکھنا پیندا اے، کیوں کہ فون تے کدی ایہہ اب کجھ کھل کے نہیں کہہ پائی۔

اج ایونٹ وچ، جیویں ایہدا مقصد سی ''اپنوں کے نام'' میں فیصلہ کیتا کہ اج اپنے دل دی ساری گل اپنے والد صاحب نوں اک خط لکھ کے کہواں گی۔ میں اپنی ساریاں سوچاں، احساسات، تے زندگی دے مشکل لمحے لکھے، تے اپنی محبت وی ظاہر کیتی۔ اوہ خط میں فوٹو لمز دے ذریعے پوسٹ کر دتا۔ تے میری اُمید اے کہ اوہ خط جلد ہی اوہناں تک پہنچے گا، تے میں جواب دی منتظر آں۔

ایس دے بعد ایونٹ دا باقی حصّہ بہت دل چسپ سی۔ تھوڑی دیر وچ ایونٹ دے سنجیدہ حصّے توں ہٹ کے میں تے میرے دوست زیورات دے اسٹالز تے گھومے تے ایک گول گپے والا وی نظر آیا، جتھے میں تے میرے دوستاں نے گول گپے کھائے۔ گول گپے اینے زیادہ خاص نہیں سن، پر پھیر بھی بھکھ پوری کر کے مزہ آیا۔

سب توں زیادہ یادگار لمحہ اوہ وقت سی جدوں میں تے میرے دوستاں نے پولورائڈ فوٹو لین دا فیصلہ کیتا۔ پنج سو روپیہ دے کے فوٹو لینا تھوڑا مہنگا محسوس ہوندا سی تے ہاسٹل دے حساب نال میرا بجٹ تھوڑا تنگ سی، پر فیر سوچیا کہ ایہہ لمحہ خاص ہے، اس لئی خرچ کرنا ضروری ہے۔ مینوں تھوڑی تشویش سی کہ فوٹو اچھی آئے گی یا نہیں، کیوں کہ اگر خراب نکلدی ہے تاں پیسے ضائع ہو جاندے لیکن خوش قسمتی نال، فوٹو بہت سوہنی نکلی، اوہ لمحہ واقعی بہت خاص سی۔

ایونٹ رات ۱۰ بجے ختم ہویا، تے تھکن دی وجہ نال میں ہاسٹل واپس آ گئی۔ جدوں میں بستر تے لیٹی، میں محسوس کیتا صبح موڈ خراب ضرور سی پر دن دی حقیقت کجھ ہور نکلی تے ایہہ ثابت ہو گیا کہ صبح دا موڈ ہمیشہ پورے دن دا فیصلہ نہیں کر سکدا۔ کل تک رب راکھا۔

۹ نومبر ۲۰۲۴ء

اگلا دن بالکل معمول دے مطابق گزریا۔ روٹین ویسی ای سی۔ اُٹھی کھانا کھاہدا تے پڑھائی کیتی۔ میری تن ڈیڈ لائنز سن، اِک اج یعنی ہفتے والے دن تے دو اتوار والے دن۔ ایس لئی میں سوچیا کہ اج زیادہ تر کم مکمل کر کے کل دے لئی وقت بچاواں گی۔

رات ۷ بجے میں گروپ چیٹ وچ پیغام دیکھیا، جتھے سارے دوست ایوی بائکس (Evee Bikes) تے باہر جان دا پلان بنا رہے سن، پہلے میں سوچیا کہ نہ جاواں، کیوں کہ کم بھی کرنا سی، تے میں نے انکار کر دتا۔ فیر رات نوں وجے جدوں سب پیغام بھیج رہے سن کہ ''سب کھوکھے تے جمع ہو جاؤ'' میں دل ای دل وچ چاہ رہی سی کہ چلی جاواں۔ میں آخر وچ سوچیا کہ چلی جانی آں تے جان دا فیصلہ کیتا۔

ہن ۶ بائیکس سن، یعنی ۱۲ الوگ۔ اسی باہر نکلے، تھوڑی دیر گھومے تے فیر ڈیفنس رایا گئے۔ اک جگہ تے جو مینوں ٹھیک توں یاد نہیں، کجھ جنگلی کتے ساڈے پچھے لگ گئے۔ ایہہ لمحہ بہت ڈرادین والا سی، کیوں کہ میں

کُتیاں توں پہلے ہی بہت زیادہ ڈرنی آں۔ ایہہ اوہ وقت سی جدوں مینوں اپنی پیدائش تے افسوس ہویا تے میں آیت الکرسی وی بھل گئی۔ پر خوش قسمتی نال، اسی کتیاں توں بچ کے نکل آئے۔ لیکن ایہہ ایڈونچر ختم نہیں ہویا۔ بعد وچ سب توں زیادہ ڈراونا لمحہ اوہ سی جدوں پنجاب پولیس نے ساریاں نوں روک لیا۔ جدوں اوہناں نوں پتہ چلیا کہ اسی لمز والے ہاں، اوہ ہور وی زیادہ ضدی ہو گئے۔ اوہ پیسے منگ رہے سن۔ آخر کار ۱۰۰۰ روپیہ دے کے اسی بچ کے نکل آئے۔

فیر تھوڑے سکون واسطے اسی آئس کریم کھائی تے رات دے ایس ایڈونچر دے بعد واپس آئے۔ ایہہ لمحے ڈراونے تے مزے والے سی۔ ایہہ دن داسب توں بڑا لمحہ سی۔ حقیقت وچ بہت مزہ آیا تے میں اپنے فیصلے تے خوش ہاں۔ اُمید ہے کہ کل تک میں اپنا کم مکمل کر لواں گی تے میں اپنے فیصلے تے پچھتاواں گی نہیں۔ انشاء اللہ۔

۱۰ نومبر ۲۰۲۴ء

اج میں کوئی خاص چنگا محسوس نہیں کر رہی، شاید کل دے ٹرپ تے سموگ نے اثر کیتا سی۔ گلا خشک سی تے جسم تھکیا تھکیا محسوس ہوندا سی۔ کم وی مکمل کرنا سی۔ ڈیڈلائنز پوری کرنیاں نیں تے کجھ ہور وی ضروری کم باقی نیں مگر اک ہور گل سی جس نوں میں ٹال نہیں سکی۔ اج میرا LCSS دا چلڈرن ہسپتال (Children Hospital) وزٹ سی۔ ایہہ اک ٹوائے ڈرائیو سی، جتھے سانوں کینسر دے مریض بچیاں نوں تحفے تے کھلونے دینے سی۔ میں سوچیا شاید اج دا دن آرام تے ڈیڈلائنز دا ہووے گا، پر ایہہ کم میرے لئی ردّ کرنا ممکن نہیں سی۔

جدوں اسی ہسپتال پہنچے، میری طبیعت ہور وی بگڑ گئی، اوہناں معصوم بچیاں دے چہرے، اوہناں دی مسکراہٹ، اوہناں دیاں اکھیاں وچ دُکھ ساری حقیقت میرے دل تے بوجھ بن گئی۔ اوہ بچے جیہناں نے اپنی زندگی دے سب توں وڈے دکھ سہے نیں اوہ میرے کول بیٹھے سن تے اوہناں نوں کھلونے دیندے وقت میں

انتہائی بے بس محسوس کر رہی ساں۔

چند بچیاں نے بس ہنسی نال ساڈے کول آ کے تحفے لے سن، مگر میں اوہناں دی مسکراہٹ وچ چھپیاں ہوئیاں اُمیداں تے دُکھ محسوس کر رہی سی۔ میری اکھّاں نم ہو رہیاں سن، لیکن میں نہیں چاہندی سی کہ اوہ بچے مینوں ویکھ کے پریشان ہون۔ مگر پتہ نہیں کیوں اندر ہی اندر اک گہرا دکھ محسوس ہو رہیا سی۔

ایہہ لمحہ میرے لئی اک وڈی یاد بن گیا کہ اسی اپنی روزانہ دی زندگی وچ کسے وڈے مسئلے نال لڑ رہے ہوواں گے مگر کسی ہور دے مسئلے ساڈے مسئلیاں توں وڈے ہوندے نیں۔ اوہ بچے جیہڑے زندگی دے سب توں وڈے دُکھاں دا سامنا کر رہے سن، اوہناں دیاں مسکراہٹاں تے ہمت نے مینوں حیران کر دتا۔ میں اپنے مسئلے بہت چھوٹے محسوس کر رہی آں۔ میری تھکن، میرے کم دی پریشانی کجھ وی نہیں سی، اوہناں دے مقابلے وچ اوہ بچے جیہڑے ہر روز اک وڈی تے نویں لڑائی لڑ رہے نیں۔ اوہناں دے سامنے میری تکلیف کجھ وی نہیں۔

اج دے دن توں میں ایہہ سکھیا کہ زندگی دے چھوٹے مسائل تے پریشانیاں اصل وچ کوئی معنی نہیں رکھدیاں۔

اج دا دن کافی چنگا سی، میں بہت کجھ سکھیا۔

❋ ❋ ❋

اسما اشرف

ڈائری

شکروار

اج میں اک کورئین ڈرامہ ویکھیا۔ جو کہ اک "جونگنیئون" نامی کڑی دے بارے سی۔ ایس ڈرامے وچ جونگنیئون تھیٹر ادکارہ بننا چاہندی ہے تے ایس دوران آن والیاں رکاوٹاں تے مصیبتاں وکھائیاں گئیاں نیں۔ اج دی قسط وچ جونگنیئون جو اپنا سپنا پورا کرن لئی اپنا گھر بار تے اپنی ماں تک نوں چھڈ کے اک نکے جیہے قصبے توں سیوٴلSeoul(کوریادادارالحکومت) آئی سی، اس دی آواز(Vocal Cards)زیادہ ریاض کرن دی وجہ توں چلی گئی تے سارے حکیماں تے ڈاکٹراں نے اوہنوں جواب دتا کہ ہن اوہ زندگی وچ کدے وی فیر گانا نہیں گا سکدی۔ میں ایہدے بارے سوچیا کہ جے اک بندے کولوں اوہدے جیون دی وجہ، اوہدا مقصد تے اوہدے سپنے چھین لئے جاون تے اوہ بندہ کیہ کرے گا؟ اک گلوکار، جس دا جیون دا مقصد گانا ہووے اوہدی آواز چلی جاوے تے اوہ کیہ کرے گا۔ اک انسان جیہدی زندگی دا کوئی مقصد نہیں ہوندا اوہ صرف اک کھوکھلا جسم ہوندا ہے جس دی کوئی روح نہیں ہوندی۔ ایس گل نے مینوں اپنے زندگی دے مقصد دے بارے سوچن اُتے مجبور کیتا کہ میری زندگی دا مقصد کیہ ہے۔ میں کیہڑی منزل دے پچھے دوڑ رہی آں، تے مینوں جواب ایہہ ملیا کہ میں اندھا دھند دوڑ رہی آں۔ میں پڑھ ایس لئی رہی آں کہ سارے پڑھدے نیں۔ میں کم ایس لئی کرناں اے کہ پڑھن توں بعد سارے کم کردے نیں۔ جے میں نہیں کیتا تے کیہ ہووے گا لوک کیہ سوچن گے، دنیا کیہ سوچے گی۔ ایس دنیا دے پچھے لگ کے اسی چل رہے آں بغیر کسی منزل دے تے اپنے ربّ نوں وی اسی ایس دوڑ وچ بھُلا دِتا۔ ربّ نوں ناراض کر کے اسی اپنے لئی خوشیاں ڈھونڈدے پھردے آں، تے فیر سوچدے

آں کہ ساڈے کم اپنے اُلجھ کیوں گئے نیں۔ کجھ وی صحیح کیوں نہیں ہو رہیا۔ ایس سب دی ایہی وجہ ہے کہ اسی اپنے رب نوں بھلا دتا۔ ایس ای سوچ وچ میر اسارا دن گُزر گیا۔

چھن چھن وار

ہفتے دی سویر میں ۱۱:۳۰ وجے اُٹھی تے اپنی سہیلیاں نال میں ناشتہ کیتا۔ ناشتے توں اسی ۱۲:۳۰ وجے فارغ ہوئے۔ ہوسٹل آن توں بعد میں آیا باجی کولوں کمرے دی صفائی کرائی تے اپنے گھر فون اُتے گل کیتی۔ میری وڈی بھین داماسٹرز واسطے پیاس یونیورسٹی وچ داخلہ ہویا سی تے اُس دے جان لئی تیاریاں ہو رہیاں سن۔ میری دوجی بھین وی گھر ملن آئی سی، ایس لئی میں تھوڑی دیر اُس دے نال گل کیتی تے فیر میری دادی آگئی سی تے میں اوہناں نال گل کیتی۔ میں دادی نوں آکھیا کہ اوہناں نے کتھوں ہجرت کیتی سی۔ دادی نے مینوں دسیا کہ تقسیم ہند دے ویلے اوہ پیدا ای نہیں ہوئی سی، لیکن اوہناں دے ماں پیو ہریانہ دے اک گاؤں ''باس'' توں آئے سن تے سندھ وچ جھڈو وچ آوسے۔ ایس توں بعد میں دادا بارے آکھیا تے مینوں آکھیا کہ تقسیم ہند ویلے اوہ بہت چھوٹے سن تے اوہناں نے حصار دے اک گاؤں ''جھنپہ'' توں ہجرت کیتی۔ ایس ویلے میرے وڈے دادا (میرے دادا دے وڈے بھرا) فوج وچ سن ایس لئی اوہناں نوں حکومت دی طرفوں فیصل آباد وچ گھر دتا گیا سی۔ وڈے دادا نے اوہناں نوں آکھیا کہ ایہہ سارے لوک جیہڑے ساڈے نال ہجرت کر کے آئے نیں اوہناں نوں وی گھر دیو۔ لیکن اوہناں نے آکھیا کہ حکومت صرف فوج دے لوکاں نوں گھر دیندی ہے ایس لئی ایہناں لوکاں نوں اسی گھر نہیں دے سکدے۔ ایس لئی میرے وڈے دادا نے فیصل آباد دا اوہ گھر لین توں انکار کر دتا کہ جدوں ایہناں لوکاں نوں گھر دیو گے فیر ای اسی گھر لواں گے نہیں تے نہیں۔ تے واہگہ بارڈر دے کجھ میلاں دے فاصلے تے ہارون آباد وچ وس گئے۔ ہارون آباد دی ایہہ تھاں پہلاں توں ایس طرح دی نہیں سی۔ ایہہ پہلاں ریتلے ٹبّے ہوندے سن تے ہولے ہولے لوکی آ کے ایس تھاں وسدے گئے تے ایہہ تھاں آباد

کر دے گئے۔ ایہہ کہانی سنن توں بعد میں سوچیا کہ پہلاں زمانے دے لوک اک دوجے دا کنّاں احساس کر دے سن کہ تسی گھر، اپنی رہائش دی تھاں، چھڈ دتی اوہناں لوکاں لئی جیہناں نال تسی پہلی وار ملے سی تے جیہناں نال تسی ہجرت کیتی سی۔ جدوں اوس ویلے دے حالات ایہو جیہے سن کہ سوون دی تھاں لبھ جاوے تے غنیمت اے۔ اوس ویلے پکا گھر ملدا اپیا سی تے چھڈ دتا۔ جے اج دے زمانے وچ اسی ایہہ گل سوچیے تے ایہہ صفت لوکاں وچ بالکل مُک گئی ہے۔ تے ایس ای سوچ دے نال رات داویلا ہو گیا سی تے میں کھانا کھاہدا تے واپس آن توں بعد میں سوں گئی۔

اتوار

اج سویرے میں ۹:۳۰ وجے اٹھی تے میری طبیعت ٹھیک نہیں سی، سموگ دی وجہ توں میرا گلا خراب سی تے مینوں ہلکا بخار وی محسوس ہو رہیا سی۔ میں فیر وی اپنی سہیلیاں نال ناشتہ کیتا تے واپس آ گئی۔ میں آن توں بعد پڑھن دے موڈ وچ نہیں سی، ایس لئی اپنا موبائل فون ورتنا شروع کر دتا۔ ایس دوران میں اک سٹیٹس ویکھیا جیہڑا ساڈے ملک دے وزیر اعظم بارے سی۔ جیہدے وچ شہباز شریف نے ڈونلڈ ٹرمپ نوں الیکشن جتن اُتے ودھائیاں دتیاں سن۔ جد کہ ٹویٹر ایکس پورے ملک وچ بند ہے۔ ایہدا مطلب ایہہ اے کہ شہباز شریف وی وی پی این توں ٹویٹر چلاندے نیں، جو قانون دے خلاف ہے۔ ایس دے بارے سوچدیاں مینوں پولیٹیکل سائنس دی کلاس چیتے آ گئی جیہدے وچ گل ہو رہی سی کہ ساڈے ملک وچ لوک قانون دی پابندی کیوں نہیں کر دے؟ جدوں ساڈے ملک دے حکمران کھُل کے قانون توڑ دے نیں تے لوکاں کولوں کیہ آس رکھی جا سکدی ہے۔ جے ساڈے سامنے صرف ایہو جیہیاں مثالاں نیں تے فیر اسی کیہ سکھاں گے؟ ایہہ گل نہیں کہ پاکستان وچ لوک پہلاں ٹویٹر نہیں ورتدے سن پر ہُن اوہناں نوں جواز مل گیا ہے کہ "ویکھو! وزیر اعظم وی ورت رہے نیں" تے ایہو وجہ ہے کہ پاکستان ترقی نہیں کر سکدا کہ اسی اپنے اعمال دا جواز ای ڈھونڈ دے

رہندے آں۔ ایس گل تے مینوں فیض صاحب دا اک شعر یاد آیا کہ

چلتے ہیں دبے پاؤں کہ کوئی جاگ نہ جائے
غلامی کے اسیروں کی یہی خاص ادا ہے

ہوتی نہیں جو قوم حق بات پر یکجا
اُس قوم کا حاکم ہی فقط اُس کی سزا ہے

کہ جے عوام ایس گل تے تنقید کر دے نیں تے رَل کے سچ تے آواز چُکدے نیں تے کیہ اوہ ملک بہتری وَل نہیں جاوے گا؟ پر ساڈی قوم دے حالات ایسے نیں کہ اوہ تعلیم وی ایس لئی حاصل کر دے نیں کہ اوہ پڑھ لکھ کے باہر جا سکن۔ جدوں لوکاں دی ذہنیت ایہو جیہی ہووے کہ ”ایس ملک دا کجھ نہیں ہو سکدا، بس پردیس چلے جاؤ“ تے فیر ایس ملک دا کیہ بنے گا؟ جدوں لوکاں دی ایہہ سوچ ہووے تے کون سب کجھ ٹھیک کرے گا؟ تے آخر اسی سارے سب کجھ اللہ تے چھڈ دیندے آں کہ صرف رب ای ساڈی مدد کر سکدا ہے۔ جدوں کہ ربّ نے ایہہ وی آکھیا ہے کہ ”انسان لئی اوہ ای ہے جس لئی اوہ کوشش کردا ہے۔“ جے تسی کوشش نہیں کیتی تے فیر سب کیویں ٹھیک ہو جاوے گا؟ تے ایہہ سوچدیاں تے لکھدیاں میرا دن مُک گیا۔

❋ ❋ ❋

زینب حُر

ڈائری

۲۶ مارچ ۲۰۲۴ء

میں فجر دی نماز پڑھن اُٹھی تے میر اسر پیڑ ہون لگ پیا۔ میں اپنی والدہ نوں دسیا تے اوہناں مینوں دوا دتی۔ میں اوہ لے کے چھیتی نال سوں گئی۔ بس فیر تھوڑی دیر بعد میر افون وج پیا، میں الارم بند کیتا تے کلاس لین لئی تیار ہون لگ پئی۔ جدوں میں تیار ہو گئی تے تھلے آئی، اپنی امّی کول بہہ گئی اوہناں دے نال گل بات کیتی فیر اوہناں مینوں جان لئی آکھیا۔ میں جا کر ابو دے کمرے دا بوہا کھڑکایا تے اوہناں کولوں پیار لے کے اپنی کلاس لئی نکل پئی۔

اج میری اک ای کلاس ہوندی اے تے اوہدا مضمون نو آبادیاتی فکر تے ہے۔ مینوں ایہہ کورس بہت من کھچواں لگدا اے کیوں کہ اوہدا سارا مواد پاکستان دی تاریخ اُتے ہیگا اے۔ کلاس دے وچ اسی مضمون پڑھیا فیر سر نے سوال جواب کیتے تے پنج وجے سانوں چھٹی دے دتی۔ میں نکلی تے میری والدہ مینوں لین آئے سن، اج دراصل پندرھاں رمضان ہے تے سانوں دعوت تے جانا سی۔ پندرھاں رمضان نوں اِمام حسنؑ دا یومِ پیدائش منایا جاندا اے تے اوس خوشی وچ ساڈے چاچے نے افطاری دا انتظام کیتا سی۔ اوہناں دا گھر گلبرگ وچ ہے تے اسی راہ چوں گڈی کھلار کے مٹھائی لے لئی کیوں کہ ایناں خوشی دا دیہاڑ ہیگا سی۔

اوتھے اَپڑ کے اساں سب نوں جشن دیاں ودھائیاں دتیاں تے سب مل کے بہہ گئے۔ اجے روزہ کھلن وچ ویہہ منٹ رہندے سن۔ اوہناں چر اسی دنیا جہان دیاں گلاں کیتیاں، اسیں سارے بڑے دناں بعد ملے ساں تے دل بڑا خوش ہویا۔ افطاری ہو گئی تے فیر قصیدے پڑھن لئی وی کسے نوں آکھیا سی۔ فیر اوہ سنے تے روح خوش

ہو گئی۔ تھوڑا چر ساریاں نے اک دوجے نال تصویراں بنائیاں تے فیر رب راکھا آکھ کے نکل پئے۔ گھر اپڑ کے جندرے کھولے تے چاہ بنا کے پیتی۔ میں تے میری والدہ روز واک کرن پارک جاندے آں پر اج اسی لیٹ ہو گئے۔ پارک نوں دس وجے جندرا مار جاندے نیں۔

بس فیر کیہ تھوڑا چر عبادت کیتی تے میں کجھ رہندا کم کلاس دا مُکایا۔ اوہ کر کے میں اپنا فون پھڑیا تے متراں نال گلاں کرن لگ پئی۔ کجھ کڑیاں بچپن توں میرے نال سن، پر ہن سب ون سونیاں یونیورسٹیاں وچ پڑھدیاں نیں۔ فیر اسی رات نوں اک دوجے نال حال چال پچھ لئی دا اے۔ میں سحری تک جاگدی رہنی آں تے جیویں تن وجدے نیں اپنی والدہ نوں جا کے اُٹھانی آں۔ جیویں تِن وجے تے میں اوہناں نوں آواز دے کے اُٹھایا۔ بس فیر سحری دی تیاری کرن لگ گئے۔ میری والدہ گھر دے وچ آپ دہی جماندے نیں، اسی زمیندار ہیگے آں تے ساڈا دُدھ روز پنڈوں آندا اے۔ فیر روز تازہ دہی جمائی دا ہے۔ سحری دے وچ سب پرونٹھے نال دہی تے اچار رکھ کے کھاندے نیں۔ بس میں ہی سادہ روٹی کھانی آں۔ سحری توں بعد آپاں سارے وضو کرن لگ پئے تے فجر دی نماز ادا کر کے اپنے اپنے کمریاں وچ سون لئی چلے گئے۔

ایہہ سی میرا اَج دا دِن۔

۲۷ مارچ ۲۰۲۴ء

اج جدوں میری اَکھ کھلی تے باہر مینہ برس رہیا سی۔ مینوں مینہ ویکھنا بڑا چنگا لگدا ہے تے میں اُٹھ کے اپنیاں کتاباں پھڑ کے چھت اتے جا کے بہہ گئی۔ اوتھے بڑی مِٹھی مِٹھی ہوا چل رہی سی۔ ایس وقت کوئی سویر دے نوں وجے سن۔ میری کلاس اِک وجے سی تے اونی دیر میں اپنا کم مکمل کیتا۔ اج میری کلاس وچ ساڈا امتحان وی سی۔ میں اوہدے لئی تیاری کیتی فیر تھوڑی دیر اپنی امی کول بیٹھی۔ دراصل مینوں مینہ ویکھ کے بڑا سکون ملدا ہے جیویں ربّ ساڈے اُتے رحمت برسا رہیا ہووے۔ مینہ دیاں کنیاں تیز ہو گئیاں تے میں چھیتی نال اندر دی

طرف ہو گئی۔

فیر بس گھر دے نکے موٹے کم کیتے تے کلاس لئی نکل گئی۔ تقریباً اوس وقت بارھاں وج کے پنتالی منٹ سن۔ میرے گھر توں لمز جان لئی پندرھاں منٹ ای لگدے نیں۔ ایس کلاس وچ میریاں دو سہیلیاں (متر) وی میرے نال نیں۔ اَسی نال نال کرسیاں تے بیٹھ گئے تے سب نے امتحان دتا۔ فیر سانوں بریک ملی، اوہدے وچ اسی گل بات کیتی۔ بس انج ای ٹائم لنگھ گیا تے میں واپس گھر آ گئی۔ افطاری دا وقت قریب سی تے اج ساڈے گھر پکوڑے بن رہے سن۔ مینوں پکوڑے بڑے چنگے لگدے نیں تے میری امی بہت ودھیا پکوڑے بناندے نیں۔ میں مغرب دی اذان نوں اُڈیک رہی ساں تاکہ چھیتی نال تتے تتے پکوڑے کھاواں۔ افطاری دا جو سواد گھر دے دستر خوان تے کرن دا ہے اوہ کتے ہور نہیں۔ افطاری کر کے چھیتی نال مغرب دی نماز ادا کیتی تے چاہ واسطے پانی اوپر رکھ دِتا۔

میں تے میری امی روز افطاری توں بعد چائے پینے آں تے اوس توں بعد پارک وچ واک کرن گئے۔ بس اوس پارک دے پنج چکر لا کے تھوڑا چر اوتھے ہی بیٹھ گئے کیوں کہ کھلی / تازہ ہوا چل رہی سی۔ اوتھے ہی بیٹھے ساں جو میرا فون وج پیا ایہہ میری چاچی دا فون سی۔ اوہ بڑا گھبرائے ہوئے سن تے میرے پُچھن تے اوہناں دسیا کہ چاچا دی طبیعت بگڑی اے۔ تھوڑی دیر بعد پتہ لگیا کہ اوہناں نوں پتے دی پیڑ ہو رہی سی۔ ڈاکٹر نے آکھیا ہے کہ اوہ کل دَسے گا کہ آپریشن کدوں ہووے گا۔

گھر آ کے عشاء دی نماز ادا کرن توں بعد میں اپنی بھین نوں فون کیتا۔ میری بھین میرے توں چار سال وڈی ہے تے اوہ ودیس پڑھن لئی گئی ہوئی اے۔ اوہنے لندن دی بڑی ودھیا جامعہ وچ سکالرشپ حاصل کیتی سی اوہدے نال گلاں کرن دا پتہ ہی نہیں لگا تے دو گھنٹے بیت گئے۔ اوہنے اپنے دھیاڑے بارے دسیا۔ اوہ دسدی اے کہ اوتھوں دی زندگی پاکستانوں بڑی مختلف اے، اوتھے سب لوک محنت کردے نیں تے سب اپنے کم

آپ ہی کر دے نیں۔ مینوں اوہدی یاد وی آندی سی تے بس اوہدے نال گلاں کر کے دل ہلکا ہو گیا۔

رات دے بارہ وج گئے سن تے میں اپنے بستر تے لمے پے گئی۔ فیر زندگی دے سفر بارے سوچدے پتہ ہی نہیں لگا کدوں اکھ لگ گئی۔

۲۸ مارچ ۲۰۲۴ء

اِک دم میری اکھ کھلی تے میرے والد صاحب مینوں آوازاں دے رہے سن۔ میں چھیتی نال تھلے گئی تے اوہناں دسیا کہ سحری لئی اسی باہر جا رہے آں۔ میں چادر لے کے گڈی وچ جا کے بہہ گئی۔ فیر اسی نیڑے توں ہی اپنے کزن نوں نال لیا۔ رل مل کے اسی سحری کرن اندرون شہر چلے گئے۔ اوتھے اِک مشہور ہوٹل ہے "حویلی" دے ناں توں اوتھے جا کے اسی کھانے دا آرڈر دِتا۔ کھانے وچ مرغے دی کڑاہی، مرغ چنے تے نال پراٹھے منگوائے۔ اوتھوں بادشاہی مسجد وی دسدی سی تے بہت خوب نظارہ سی کیوں کہ موسم وی بڑا چنگا سی۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی سی تے اوہدے وچ بہہ کے سب نال گلاں کرن دا بڑا ہی مزہ آ رہیا سی۔

تھوڑے ہی چر بعد ساڈا کھانا آ گیا، سب نے چھیتی نال کھادا کیوں کہ سحری دا وقت مکن والا سی۔ اوس توں بعد اسی گڈیاں وچ آ گئے تے واپس اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ ایس وقت کوئی سویر دے پنج سن، فیر میں بس سر گھی دی نماز پڑھ کے سوں گئی۔ سویرے جمعرات سی تے اوس دن میری پنجابی دی کلاس ہوندی اے۔ جدوں میں اُٹھی تے یارھاں وج کے پنجاہ منٹ سن۔ میں اُٹھ کے کپڑے استری کیتے، میں فیر نہان چلی گئی، اینی دیر وچ نماز دا وقت ہو گیا سی تے میں پیشی دی تے دیگر دی نماز پڑھی اوہ پڑھ کے میں گڈی وچ بہہ گئی کیوں کہ کلاس دا وقت نیڑے آ گیا سی۔

اج میری پنجابی دی کلاس وچ اسی ون سونیاں رُتاں دے بارے پڑھیا۔ چار رُتاں ہوندیاں نیں۔ گرمیاں، سردیاں، خزاں تے بہار۔ مینوں بہار دا موسم بڑا پسند اے پر گرمیاں مینوں سب توں چنگیاں لگدیاں

نیں کیوں کہ میری پیدائش داد یہاڑا گر میاں وچ آندا اے۔ مینوں گر میاں ایس لئی وی پسند نیں کیوں کہ انب مینوں سب توں ودھیا پھل لگدا اے۔ انب جیہڑا سب توں ودھیا لگدا اے اوہ چونسا ہے۔ فیر ساڈے اُستاد نے سانوں مشق کرن لئی دتی تے آکھیا کہ اوہ کر کے اسی گھر جاسکدے آں۔ بس میں چھیتی نال کم مُکایا تے جمع کرا کے نکل آئی۔

گھر واپس آئی تے میری پھپھی آئے ہوئے سن، افطاری دا وقت وی نیڑے سی تے اوہناں فیر روزہ ساڈے نال ہی افطار کیتا۔ افطاری وچ باداماں دا شربت تے پھلاں دی چاٹ کھادی، اوس توں بعد اپنی پھپھی نال گلاں کیتیاں۔ اوہ میرے نال بہت پیار کردے نیں تے جدوں وی ساڈے گھر آندے نیں تے میرے لئی میری سب توں پسند دی آئس کریم لے کے آندے نیں۔ میں جدوں نکی ساں تے چاکلیٹ والی آئس کریم بہت شوق نال کھاندی ساں اوہناں نال بہہ گئی تے فیر وقت دا پتہ ہی نہیں لگا۔

اج شکر وار سی، تے ہر شکر وار نوں میں قبرستان جانی آں۔ ٹائم تے ودھ ہو گیا سی پر میں اوہدی تیاری کیتی، میں ہر شکر وار نوں قبرستان جانی آں تے اوتھے اپنی وسط دے مطابق کسی مستحق لئی کھانا بنا کے لے کے جانی آں۔ میں اوہدی تیاری کیتی تے آلو چکن بنا کے رکھ لیا، ہن سویرے تازہ روٹیاں بنوالواں گی۔ ہن میں فارغ ہو کے اپنے پلنگ تے لمّے پے گئی۔ ہر دیہاڑے میں شکر وار نوں اُڈیکدی رہنی آں۔ میرے بہت پیارے اوس قبرستان وچ رہندے نیں تے اوہناں نوں ملن دی اک آس دل وچ رہندی ہے۔ بس فیر اوس پرانیاں یاداں بارے سوچدے سوچدے میری اکھ لگ گئی تے ایویں اک ہور دن ڈھل گیا۔

❋ ❋ ❋

لائبہ طاہر

ڈائری

۸ نومبر ۲۰۲۴ء

اج دا دن اک خاص رنگ نال شروع ہویا۔ صبح سویرے میں چہل قدمی کرن باہر نکل گئی۔ ٹھنڈی ہوا وچ اک عجب جیہا سکون سی۔ اسمان تے ہلکی ہلکی کُہر سی تے گلابی رنگ دی روشنی زمین تے پھیل رہی سی۔ جو بڑا خوبصورت منظر پیش کر رہی سی۔ چلدے چلدے میں سوچیا اج کوئی ایسا کم کراں جیہڑا میرے اندر دی توانائی نوں تازہ کر دے۔ خیالاں وچ ڈُبی میری نظر بُلھے شاہ دیاں کافیاں اُتے پئی۔ بُلھے شاہ دی شاعری دی خاصیت ایہہ اے کہ اوہدی ہر اِک سطر وچ اک گہری دُنیا چھپی ہوئی اے۔ اک تلاش، اِک درد تے ربّ نال قربت تے محبت دا جذبہ۔ اوہناں دی کافی ''بُلھیا کیہ جاناں میں کون'' پڑھی:

بُلھیا کیہ جاناں میں کون
نہ میں وچ کُفر دی ریت آں
نہ میں پاکاں وچ پلیت آں
نہ میں موسیٰ نہ میں فرعون
بُلھیا کیہ جاناں میں کون

ایہہ سطر اں مینوں اپنی شناخت تے حقیقت دی گہرائی نوں سمجھن لئی کار آمد ثابت ہوئیاں۔ کیہ میں واقعی جاندی آں میں کون آں؟ کِنے لوگ اپنی زندگی دے بارے ایہہ سوال کر دے نیں پر ایس دا جواب لبھناں کسے کسے نوں نصیب ہُندا اے۔ بُلھے شاہ دے لفظاں وچ ایہہ خود شناسی دا پیغام اے۔ اوہ کہندے نیں

میں مسیت وچ بیٹھے مومن وچوں نہیں آں۔ میری پہچان کسے خاص مذہب یا عقیدے نال نہیں جُڑی۔ میں کسی عمارت یا دھرم دے اصولاں تک محدود نہیں آں۔ میری شناخت یا روحانی حقیقت کسی خاص عقیدے دا حصّہ نہیں۔ نہ ہی میں کسی ایسے رستے تے چلا آں، جیہڑا مذہب دے خلاف سمجھیا جاوے۔ میری اصلیت نہ پیغمبر دے کردار نال جُڑی اے ناہی فرعون دی شخصیت نال۔ انسان دا رستہ کسے دوسرے دی نقالی توں وکھرا ہو سکدا اے۔ مینوں ایہہ پڑھ کے محسوس ہویا کہ انسان دی حقیقت یا خدا توں نزدیکی ایس دی بیرونی عقیدے یا ایس دے ظاہر نال نہیں جُڑی بلکہ ایہہ اک اندرلی کیفیت اے جیہڑی کسی عقیدے وچ قید نہیں ہو سکدی۔ ربّ نوں محسوس کرن لئی میں کسی خاص دھارے وچ بنھی نہیں۔ انسان دا اصل سفر اندروں باہر نوں نہیں بلکہ باہر توں اندر نوں ہونا چاہیدا اے۔ ایہہ ہی ربّ نوں سمجھن دی حقیقت اے۔ ایہہ سوچ مینوں روحانی طور تے آزاد کر دی اے جتھے مینوں اپنے آپ نوں کسی خاص عقیدے یا تعریف وچ فٹ کرن دی ضرورت نہیں۔ مینوں اپنے اصل دی کھوج اے۔ ایہہ لفظ سادہ ضرور سن پر اوہناں دی گہرائی میرے اندر کُجھ سوال، چنگاریاں وانگ روشن کر دتے۔

۹ نومبر ۲۰۲۴ء

اج صبح میں اپنی دوست ماہم نال بیٹھی ساں تے لاہور دے اک مشہور کتب خانے "پنجاب پبلک لائبریری" بارے گل ہو رہی سی۔ ایہہ کتب خانہ مال روڈ تے واقع اے تے پنجاب دے ورثے نال جُڑی ہوئی اک کہانی سنبھالی پیا اے۔ کتب خانے دے ساہمنے اِک وڈا باغیچہ سی جس وچ مختلف قسم دے پُرانے درختاں دی خوشبو محسوس ہو رہی سی۔ لائبریری دی عمارت اِک قدیم طرز دی مثال اے جیہڑا ماضی دیاں یاداں نوں زندہ رکھن لئی اے۔ اندر داخل ہو کے ساہمنے مختلف شعبے بنے ہوئے سن۔ ماہم نوں پنجابی ادب دا خاص شوق سی تے میں وی پنجابی تے اُردو مشہور لکھاریاں دے بارے جانن لئی بہت دل چسپی رکھدی ساں۔ سب توں پہلاں اسی

امرتا پریتم دا مجموعہ پڑھیا۔ اوہ پنجابی زبان دی اک وڈی خاتون شاعرہ تے ناول نگار نیں جیہدی لکھائی وچ اوہدی زندگی دے تجربے تے دُکھ درد دا اثر واضح نظر آوندا اے۔ ''پنجر'' اوہناں دا سبھ توں مشہور ناول اے، جیس وچ اوہناں نے ''پارو'' دا کردار تخلیق کیتا جو عورتاں اُتے ہوئے تشدّد، انسانیت دے زوال تے وجودی تقدیر دے حوالے نال اِک علامت بن گیا۔ اوہناں دی درد بھری نظم ''اج آکھاں وارث شاہ نوں'' وچ اوہ برطانوی ہند دی تقسیم دے دوران ہوئے قتل وغارت تے مظالم تے غصّے دا اظہار کردیاں نیں۔

اج آکھاں وراث شاہ نوں کتوں قبراں وچوں بول!
تے اج کتابِ عشق دا کوئی اگلا ورقہ پھول!
اک روئی سی دھی پنجاب دی توں لکھ لکھ مارے وین
اج لکھاں دھیاں روندیاں تینوں وارث شاہ نوں کہن
وے درد منداں دیا دردیا! اُٹھ تک اپنا پنجاب
اج بیلے لاشاں وچھیاں تے لہو دی بھری چناب

اگے اسی فیض احمد فیض دی پہلی کتاب ''نقشِ فریادی'' دا مطالعہ کیتا۔ اوہ اِک عظیم شاعر سن جیہناں دی شاعری وچ محبت، انقلاب، انصاف تے انسانی ہمدردی دے جذبات نمایاں سن۔ مینوں اوہناں دی نظم دے کجھ اشعار بڑے پسند آئے:

ربا سچّیا توں تے آکھیا سی، جا اوئے بندیا جگ دا شاہ ہیں توں
ساڈیاں نعمتاں تیریاں دولتاں نیں، ساڈا نیب تے عالی جاہ ہیں توں
ایس لارے تے ٹور کد پچھیا ای، کیہ ایس نمانے تے بیتیاں نیں
کدی سار وی لئی او ربّ سائیاں تیرے شاہ نال جگ کیہ کیتیاں نیں
کتے دھونس پویس سرکار دی اے، کتے دھاندلی مال پٹوار دی اے
ایویں ہڈیاں وچ کلپے جان میری، جیویں پھاہی وچ کونج کُرلاوَندی اے

چنگا شاہ بنایا اِی رَبّ سائیاں، پولے کھاندیاں وار نہ آوَندی اے

فیض دی ایہہ نظم وی اِک گہری حقیقت تے انساناں لئی پیغام اے۔ سانوں ایہنوں سمجھن دی ضرورت اے۔

۱۰ نومبر ۲۰۲۴ء

اج میرے لئی اک خاص دن سی میں اپنے دوستاں نال بیٹھ کے پنجابی فلم ''انگریج'' ویکھی۔ فلم ویکھدے ہوئے اسی ہسدے، روندے تے پنجابی ثقافت دی مٹھاس تے رنگینیاں وچ کھُبھ گئے۔ ایہہ میری زندگی دااِک یادگار دن بن گیا۔ انگریج (۲۰۱۵ء) پنجابی زبان دی اک تاریخی رومانوی فلم اے جس نوں سمر جیت سنگھ نے ڈائریکٹ کیتا اے۔ ایہہ فلم برطانوی راج دے زوال دے پس منظر وچ بنی اے تے اِک نوجوان مُنڈے انگریج (امریندر گل) تے دھن کور (سرگن مہتا) دی کہانی بیان کردی اے، جیہڑے مختلف طبقیاں نال تعلق رکھدے نیں۔ انگریج تقسیم توں پہلاں دی کہانی بیان کردا اے۔ اوہدی ملاقات ماڑو نال ہوندی اے۔ اوہ تے اوہدا یار اسلم نال دے پنڈ وچ میلہ ویکھن جاندے نیں تے نال ماڑو نوں ملن وی۔ اوہ انگریج نوں بڑی سوہنی لگدی اے تے اوہنوں اوہدے نال پیار ہو جاندا اے۔ ماڑو وی انگریج نال پیار کردی اے۔

انگریج ماڑو نوں شادی دی پیشکش کردا اے پر اوہ چکدی اے کیوں کہ اوہدے گھر والے پیار دی شادی نوں قبول نہیں کرن گے۔ انگریج دی ماں وی پیار نوں عام طور تے پسند نہیں کردی پر اوہدی بھابھی شادی دا انتظام کرن دی گل کردی اے۔ جدوں انگریج ماڑو نوں شادی دا پیغام دسن لئی جاندا اے تے اوتھے ماڑو دا پیو اوہناں نوں ویکھ لیندا اے۔ ایس توں پہلاں اوہ اپنی صفائی وچ کُجھ کہہ سکدا اِک سپ پیو نوں ڈس لیندا اے تے اوہ بولن دی صلاحیت کھو دیندا اے۔ دوجی طرف حاکم، لاہور توں اِک امیر زمیندار اے تے ماڑو دی دادی دا دور دا رشتہ دار اے، ماڑو دے گھر آنا جانا شروع کر دیندا اے۔ اوہدی نظر ماڑو تے ہوندی اے تے اوہ اوہنوں

پھسان لئی تحفے دیندا اے۔ ماڑو نوں وی لالچ آ جاندا اے۔ انگریج اپنی اکلوتی مجھ نوں ویچ دیندا اے جو اوہ ماڑو لئی سونے دے کنگن خرید سکے۔ پر ماڑو کہندی اے کہ اوہدے گھر والے انگریج دی مالی حالت نوں قبول نہیں کرن گے۔ اوہ حاکم دیاں پیشکشاں نوں قبول کر دی اے۔ انگریج ایہہ ویکھ کے دُکھی ہو جاندا اے کہ ماڑو اوہنوں چھڈ کے حاکم نال ملاقاتاں کر دی اے۔ اوہ لاہور توں ماڑو لئی ریڈیو لیاندا اے تے ماڑو نوں دیندا اے۔ انگریج ایس دھوکے نوں برداشت نہیں کر پاندا تے بالکل اداس ہو جاندا اے۔ انگریج دی ملاقات اپنی بھین دی شادی اُتے دھن کور نال ہوندی اے جیہڑی اوہدی بھین دی سہیلی اے۔ اوہ پنج جماتاں پڑھی اے تے عقل مند وی اے۔ اگلے چند دناں وچ انگریج تے دھن کور دی دوستی ہو جاندی اے۔ ماڑو تے اوہدے گھر والے وی اوس شادی اُتے آندے نیں۔ دھن کور انگریج دی مدد کر دی اے کہ ماڑو انگریج نوں پسند کرن لگ جاوے پر ایس چکّر وچ اوہ آپ ای انگریج دی طرف راغب ہو جاندی اے۔ حاکم وی اوتھے آ جاندا اے تے اوہنوں ہُن دھن کور وی پسند آ جاندی اے تے اوہ اوہدے نال چھیڑ چھاڑ کرن دی کوشش کر دا اے۔ ایہہ ویکھ کے انگریج نوں غصّہ آ جاندا اے تے اوہ ماڑو دے سامہنے اوہدی (حاکم) دی اصلیت لیاندا اے۔ ماڑو روندی اے۔ شادی دا ویلا ختم ہو جاندا اے تے سارے مہمان اپنے گھر پرت جاندے نیں۔ انگریج دھن کور نوں وی الوداع کہندا اے جو ہن تک اوہدے نال گہری محبت وچ مبتلا ہو جاندی اے۔ انگریج زمیندار وانگ لباس پا کے ماڑو کول جاندا اے۔ اوہنوں ایس روپ وچ ویکھ کے ماڑو اوہنوں شادی لئی آکھدی اے۔ پر انگریج محسوس کر دا اے کہ اوہ ہن ماڑو نال پیار نہیں کر دا بلکہ دھن کور نے اپنی مضبوط شخصیت تے مزاحیہ فطرت نال اوہدا دل اپنے ول متوجہ کر لیا اے۔ اوہ ماڑو نوں تحفے وچ کنگن تے دیندا اے پر فیر دھن کور دی منگنی ہو چکی اے۔ اوہ دُکھی ہو کے لوٹ جاندا اے۔ فیر کجھ دناں بعد اسلم اوہنوں دسدا اے کہ دھن کور دا منگیتر حاکم اے۔ انگریج دھن کور دے پیو نال گل کر دا اے تے اوہنوں حاکم دی حقیقت دسدا اے، پر اوہ غصّے وچ آ کے اوہنوں گولی مارن دی دھمکی دیندا

اے۔ ماڑو دا پیو جیہڑا اپنی فالج دی تکلیف توں ٹھیک ہو چکیا اے انگریج دے حق وچ گواہی دیندا اے۔ آخر کار انگریج تے دھن کور دی شادی ہو جاندی اے۔ دھن کور اوہنوں کنگن لئی وی آکھدی اے۔ موجودہ دور وچ انگریج دھن کور دی آخری خواہش دے مطابق اوہدی راکھ نوں اوہناں دے پرانے گھر دے کول کھیتاں وچ دبا دیندا اے۔

❋ ❋ ❋

کشمیری

ڈاکٹر زاہد عزیز

عبد الاحد آزاد: شاعر انسانیت

شاعر انسانیت، عبد الاحد آزاد، کشمیر کے انتہائی نازک اور انقلابی دور کے شاعر ہیں۔ آپ کی شاعری نے جب شباب کی دہلیز پر قدم رکھا تو اس وقت تحریک آزادی کشمیر اپنے عروج پر تھی۔ در حقیقت یہ کشمیری مسلمانوں کی بیداری کا عہد تھا۔ کشمیری عوام سیاسی شعور سے آگاہی حاصل کر چکے تھے۔ کشمیر کی مسلم آبادی اپنے ابتر حالات کی وجہ سے نالاں تھی۔ بالخصوص کشمیر کا پڑھا لکھا طبقہ مناسب روزگار نہ ملنے کی وجہ سے تنگ تھا۔ تجارتی میدان میں معاشی زوال کے باعث مزدور اور چھوٹا طبقہ پریشان حال تھے۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ء کا عشرہ تحریک آزادی کشمیر کا نہایت ہی جاندار اور اہم دور تصوّر کیا جاتا ہے۔ ۱۹۳۱ء کے سانحات نے جہاں نوجوانانِ کشمیر کو حریت کی راہ پر چلنے کے لیے نیا ولولہ، جوش اور صحیح سمت سجھائی اس کے ساتھ ساتھ شاعروں اور ادیبوں کے حساس دلوں کو بھی متاثر کرنا شروع کیا اس طرح وہ انقلاب کی لے پر آزادی کے گیت گانے لگے کشمیری کلام معہ ترجمہ پیش خدمت ہے۔

کشمیری کلام:

چأنی آئو چھ لولک راز
چأنی صَدا کُونرِچ آواز

ترجمہ: تمہاری پکار میں محبّت کا راز ہے۔ تمہاری صدا میں یگانگت کی آواز ہے۔

کشمیری کلام:

کِمس ہاوہ پئنٔی دأدی کِمس ہاوہ دِلکی اَخ
یُس ئستی اوسُم وعدہ تِمس چھُم نہ وفائی

ترجمہ:　　اپنا دُکھ درد کس کو بتاؤں اور کس کو دکھاؤں اپنے زخم دل جس کے ساتھ میرا وعدہ تھا۔ وہی بے وفا نکلا۔

Words Worth قدرت کا پجاری تھا اور اس کی خوبصورتی پر فریفتہ بھی۔ یہ چیزیں آزاد کی نظموں میں بھی بکثرت ملتی ہیں۔

کشمیری کلام:

دُورہ　ڈِیُوٹھم　چون　پَرتو
نُورہ　ژادر　زَن　بَر　ہوا
موختہ　جالرن　چُونہ　جرٔی　جرٔی
روزی　دماہ　پان　ذادریے

ترجمہ:　　دور سے تیرا پرتو دیکھا۔ نُور کی ایک چادر ہوا سے پھیلی ہوئی ہے موتی کی جھالر میں نگینے اور ہیرے جڑے ہوئے ہیں۔ اے آبشار ایک لمحہ کے لیے ٹھہر جا۔

انگریزی زبان کے مشہور شاعر Shelley کی طرح آزاد بھی قدرت کے مختلف مناظر میں ایک ہی طاقت پوشیدہ پاتا ہے۔

کشمیری کلام:

دِتُم　پَرواز　اوٗبرس　رَاُحتُک　تاثِیر　بارانَس
وَلِم　یِم　نِیلی　جامہ　تہ　لاجَوردی　جاَمہ　آسمانَس

ترجمہ:　　میں نے ہی بادل کو چلنے کی قوت دی۔ میں نے ہی بارش میں راحت کی تاثیر بخشی۔ میں نے نیلے اور لاجوردی لباس آسمان کو پہنائے۔

درحقیقت کوئی انقلابی آزاد کی نظموں اور غزلوں کو کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتا۔ آزاد کو یقین کامل تھا کہ وہ دن بھی جلد آئے گا جب اُن کا پیغام رنگ لائے گا۔

کشمیری کلام:

جَہانَس تنُبہ لاوان میون دِلبَر جَلوہ ہاوَان دراوَ
پھولان دِل چھُم ژلان جِگرُک حِباب آہستہ آہستہ

ترجمہ: دُنیا کو للچاتا ہوا دلبر اپنا جلوہ دکھاتا ہوا ظاہر ہو گیا۔ میرے دل کی کلی کھل رہی ہے۔ میرے جگر پر جو بوجھ تھا وہ آہستہ آہستہ دور ہو رہا ہے۔

کشمیر کے یہ انقلابی شاعر آزادی اور انقلاب کے ترانے سناتے سناتے ۱۹۴۸ء کو صرف ۴۵ سال کی عمر میں اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔

❁❁❁